امرتا پریتم

ایک سوال

ایک سوال

امرتا پریتم

چودھری اکیڈمی لاہور

۳۰۵۔ ذوالقرنین چیمبرز۔ گنپت روڈ۔ انارکلی

درِ جمیل پہ سورج برات لے آیا
کوئی کرن بھی قدم اٹھ کر اُسکے لے نہ سکی
ہمارے عشق نے سادہ سا اک سوال کیا
کہ جس کا ساری خدائی جواب دے نہ سکی

ناشر ——— محمد خالد چودھری
اہتمام ——— میاں محمد اسلم
طابع ——— نیازی پرنٹنگ پریس
قیمت ——— نو روپے

چودھری اکیڈمی - لاہور

یہ سوال اس کے لیے ہے جس نے مجھ سے کہا تھا

——— مجھے سرتاپا جواب بنالو ———

دیباچہ

پورے گیارہ سال کی نہیں تھی جب ماں فوت ہوئی - ماں کی زندگی کا آخری
دن چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کے ساتھ میری یاد میں محفوظ ہے" ایک سوال" ناول میں
ناول کا ہیرو جگدیپ مرتی ماں کے بستر کے پاس جس طرح کھڑا ہے، اسی طرح میں
اپنی مرتی ماں کے بستر کے پاس کھڑی تھی اور میں نے جگدیپ کی مانند دل اور ذہن
کی یکسوئی کے ساتھ خدا سے کہا تھا" میری ماں کو نہ مارنا" اور مجھے بھی اس کی طرح
یقین ہو گیا تھا کہ اب میری ماں نہیں مرے گی کیونکہ خدا بچوں کا کہا نہیں ٹالتا...
لیکن ماں مر گئی تھی اور میرا بھی جگدیپ کی طرح خدا پر سے اعتقاد اٹھ گیا تھا۔
اور جس طرح جگدیپ اس ناول میں ماں کے ہاتھ کی پکی ہوئی اور ایک
طاق پر رکھی ہوئی دو سوکھی روٹیوں کو اپنے پاس سنبھال کر رکھ لیتا ہے "ان روٹیوں
کو تھوڑا تھوڑا کر کے کئی دن کھاؤں گا"۔ اسی طرح میں نے ان سوکھی روٹیوں کو
پیس کر ایک شیشی میں ڈال لیا تھا۔

۱۵ رمئی ۱۹۷۳ء کو جب دہلی یونیورسٹی نے آنریری ڈی، لٹ کی ڈگری
عطا کی تو گھر آنے پر دیویندر نے اپنی جیب میں کچھ چھپا کر کہا "دیدی آج کوئی من آئی
کرنے کو جی چاہتا ہے ناراض نہ ہونا"۔ جواب میں ہنس پڑی تھی۔ "ارے تیری
من آئی چیز بھی ہوگی اچھی ہوگی"۔ اور دیویندر نے جیب سے ایک ریشمی رومال،

مصری اور اکیس روپے نکال کر کہا "دیدی! آپ کا کوئی باپ یا بھائی ہوتا۔ کوئی شگن کرتا۔ یہ شگن ان کی طرف سے۔" آنکھیں بھر بھر آئیں اور یاد آیا " ایک سوال" ناول میں جب ناول کا ہیرو لینہ باپ کی موت کے بعد اپنی بھرپور جوان سوتیلی ماں کی اپنے ہاتھ سے اس کی من چاہی شادی کرتا ہے۔ اور وہ پُرشباب لڑکی تھالی میں روٹی پروس کر کہتی ہے۔ آؤ ماں بیٹا مل کر کھائیں۔ تو وہ روٹی کا پہلا لقمہ توڑتے ہوئے کہتا ہے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم میری ماں لگتی ہو بہن لگتی ہو یا میری بیٹی لگتی ہو؟ تب ناول کا یہ حصہ لکھتے ہوئے دیویندر میرے سامنے نہیں تھا لیکن چودہ سال بعد جب دیویندر نے وہ رومال وہ مصری اور وہ روپے میری جھولی میں ڈالے تو میرے دل میں آیا بول بعینہ وہی تھا " ارے، پہلے یہ بتا" تو میرا باپ لگتا ہے یا میرا بھائی کہ میرا بیٹا؟

نئی دلّی امرتا پریتم

"اٹھو دیپ"!

"دیپ اٹھو ——— میری طبیعت اچھی نہیں ہے ———"

جگدیپ ماں کی آواز سن کر چونک پڑا ——— ماں اس کے ماتھے پر نرم نرم ہاتھ پھیر رہی تھی اور اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑا ہوا تھا، دس برس کا جگدیپ آنکھیں ملتا ہوا ماں سے لپٹ گیا۔

"آہستہ میرے چاند ——— آہستہ ——— مجھے سخت درد ہو رہا ہے ———" ماں نے چارپائی کی پٹی کو مضبوطی سے پکڑ لیا ——— "نہ جانے پھر کبھی میں اپنے ہاتھوں سے تجھے کچھ کھلا سکوں گی کہ نہیں ——— جا میرے سورج کنوئیں پر ایک ڈبکی لگا کر میرے پاس آجا ———"

ماں کپکپاتی ہوئی چارپائی کی پٹی پر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر دالان میں پڑی ہوئی پیڑھی پر بیٹھ کر چھاچھ بلونے لگی۔

جگدیپ کنوئیں تک گیا اور الٹے پاؤں لوٹ آیا۔ ماں کے قریب آکر بولا ———

"تیری طبیعت اچھی نہیں ہے۔ ماں تو چچی سے چھاچھ بلونے کے لیے کہہ دے"

"چچی ہی سے کہوں گی میرے چاند ——— تو ذرا ایک گھونٹ یہ ادھ بلوئی چھاچھ پی لے"

"پچھلے تین روز سے ماں کے بدن میں ایک درد اٹھ کھڑا ہوا تھا ——— گاؤں کے

حکیم نے پہلے نوشہ کا مربہ دیا۔ پھر دودھ میں ایک پڑیا گھول کر دی اور اب کل رات کو حکیم کہہ گیا تھا ــــ شہر سے ڈاکٹر بلوالو ــــ یہ تو کوئی غیبی مرض معلوم ہوتا ہے"۔

"ماں قربان جائے ــــ یہ گھونٹ بھی پی لے ــــ" ماں نے پھر کہا اور دیپ نے کٹورے میں باقی چند قطرے بھی حلق میں انڈیل لیے۔

ماں سچ کہتی تھی! اس گھڑی کے بعد وہ پیڑھی پر نہ بیٹھ سکی ــ چارپائی سے اٹھنا اب اس کے بس کی بات نہیں تھی ــ دوپہر ہوئی تو دیپ کا والد گھوڑی پر سوار ہوا اور شہر سے ڈاکٹر کو اپنے ساتھ لے آیا ــــ شہر ان کے گاؤں سے کوئی تین کوس کے فاصلہ پر واقع تھا۔

"مجھے ایسا شک ہو رہا ہے کہ ان کے پیٹ میں رسولی ہے آپریشن کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ــــ" ڈاکٹر نے آدھ گھنٹہ کے معائنہ کے بعد کہا۔

"میں شہروں میں خوار ہو کر نہیں مروں گی ــــ میں کہیں نہیں جاؤں گی ــــ مروں گی تو اپنے گھر میں مروں گی ــــ دیپ کی ماں نے یہی ایک رٹ لگانی شروع کر دی۔

"بہت اچھا آج دوا دیکر دیکھ لیتے ہیں ــــ مجھے کل صبح ہی دوبارہ مطلع کر دینا۔"

ڈاکٹر نے انجکشن لگایا ــــ دوا دی اور واپس چلا گیا۔

دو گھنٹے تک ماں پرسکون رہی ــــ دیپ صبح ہی سے ماں کی چارپائی کے پاس جم کر بیٹھا تھا ــ چچی نے اس سے ــ "جا بیٹا جا کر کھیل ــــ ماں کا بال بیکا نہیں ہوگا"۔

چچی دراصل دیپ کی موسی تھی۔ دونوں بہنوں کا ایک ہی گھر میں بیاہ ہوا تھا ــــ دونوں بھائیوں سے بیاہی گئی تھیں۔ اگرچہ لوگ اسے دیپ کی چچی کہتے تھے، مگر وہ دل موسی کا رکھتی تھی دیپ نے بڑے غور سے چچی کی طرف دیکھا۔ چچی کے چہرے پر گھبراہٹ کی علامت نہیں تھی دیپ نے اطمینان کا سانس لیا اور کھیلنے کے لیے باہر چلا گیا۔

شام کو دیپ نے جب گھر کی دہلیز میں قدم رکھا تو ماں کی چیخیں باہر دالان میں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ دیپ ماں کی چارپائی کی طرف لپکا۔ چچی توے پر روئی گرم کر کے ماں کو سینک پہنچا رہی تھی اور اس کا والد دوا کی خوراک کٹوری میں ڈال کر ماں کی طرف بڑھا رہا تھا۔

دیپ وہیں کا وہیں دروازے سے لگ کر کھڑا سو گیا ——— ماں آدھ گھنٹہ تک چیخوں کے ساتھ زور آزمائی کرتی رہی —— پھر آہستہ آہستہ درد ٹھنڈا پڑتا گیا اور جب دوبارہ ماں کے دم میں دم آیا تو کمرے میں مسلط اندھیرے کو ماں نے ٹٹولتے ہوئے پوچھا "میرا دیپ کہاں ہے ——؟"

"یہ کیا بے حس و حرکت کھڑا ہے" چچی نے دیپ کا بازو پکڑ کر اسے ماں کی چارپائی کے قریب کر دیا۔

"میرے کنول کے پھول —— تو رو کیوں رہا ہے ——؟ پاگل کہیں کا —— ! کچھ کھایا بھی ہے کہ نہیں ———— چاچی سے کچھ لیکر کھا لے۔"

ماں کے انگ انگ پر دوا اپنا اثر کر رہی تھی —— پھر نصف سے زائد رات سوتے سوتے گزر گئی۔

صبح کا پہلا پہر ایک بار پھر ماں کی چیخوں سے طلوع ہوا۔ ایک گھنٹہ درد یوں ہوتا رہا جیسے کوئی سوئیاں چبھو رہا ہو اور اس کے بعد ایک بار پھر دوا نے ماں پر غنودگی طاری کر دی اور وہ غفلت کی نیند سو گئی۔

اگلے دن دوپہر کو ماں نے دیپ کو اپنے پاس بلا کر کہا —— "جا۔ نوراں کی ماں کو بلا لیا —— کہنا ذرا ایک کے آئے ——"

نوراں کا گھر دور نہیں تھا —— دیپ الٹے پاؤں لوٹ آیا —— اس کے پیچھے

پیچھے نوراں کی ماں آگئی ــــ اس کے ساتھ ساتھ سات آٹھ برس کی نوراں دوڑتی آرہی تھی۔

"میں تو ابھی ابھی نوراں کے ننہال سے آرہی ہوں ــــ آتے ہی سنا کہ سیٹھانی بیمار ہے ــــ اتنے میں دیپ پہنچ گیا ــــ کہتے ہیں شہر سے ڈاکٹر بھی آیا تھا۔ اے خدا ہماری شاہنی پر کوئی آنچ نہ آئے ــــ" نوراں کی ماں کو سوجھ نہیں رہا تھا کہ وہ اور کیا کچھ کہے ــــ اس کا گلا بھر آیا۔

"بیگم ــــ اس دم کا کیا بھروسہ ــــ ابھی سانس آتا ہے اور ابھی کچھ خبر نہیں رہتی ــــ مجھے تیری امانت لوٹانا ہے ــــ" دیپ کی ماں نے بیگم کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی چارپائی پر بٹھا لیا۔

"کیسی امانت شاہنی ــــ ؟ تجھے خدا سلامت رکھے ــــ!"

"پھر بھی بیگم ــــ نہ کوئی لکھت نہ پڑھت ــــ"

"ہمارے لیے شاہنی ــــ تُو ہے تو جہان ہے ــــ"

"دیپ ذرا ادھر آ ــــ یہ لے چابی ــــ پچھلے کمرے میں لوہے کا صندوق کھول کر لکڑی کا ڈبہ نکال کر لے آ ــــ"

بیگم روکتی رہی لیکن ماں نے چابی دیپ کے ہاتھ میں تھما دی اور وہ صندوق میں سے ڈبہ نکال کر لے آیا ــــ ماں نے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے ڈبہ کھولا ــــ

"یہ رہی تیری امانت بیگم ــــ"

"تیرے سوا ہمارا کون ہے شاہنی ــــ" بیگم نے دوپٹے کے کنارے سے اپنی آنکھیں پونچھ لیں اور کہا ــــ "تو اچھی بھلی ہے شاہنی ــــ میں اپنے ساتھ کچھ نہیں لے جاؤں گی۔ مجھے اللہ پر بھروسہ ہے ــــ"

"نہیں بیگم ـــــ میں زندہ رہی تو ـــــ" ماں کے پھر درد اٹھا ـــــ زیورات کی پوٹلی بیگم کے ہاتھ میں دیتے ہوئے اس نے کہا ـــــ "اپنی چیزیں گن کر پوری کر لے ۔ اور دیپ تو جا کر صندوق بند کر دے ۔"

دیپ نے واپس آ کر ماں کو جب چابی لوٹائی تو درد کے مارے اچھل اچھل پڑ رہی تھی ۔

"میں نے دیپ کی بہو کے لیے ستاروں کا جھماتا ہوا دوپٹہ رکھا ہوا تھا اور چاندی کے گھنگھروؤں والی پازیب ـــــ لیکن دیپ کی بہو کا منہ دیکھنا شاید میرے نصیب میں نہیں تھا ـــــ میرے دیپ کی جھلمل کرتی ہوئی بہو ـــــ چھم چھم کرتی ہوئی میرے دیپ کی دلہن ـــــ میرے ایسے نصیب کہاں تھے ۔ !

ماں کی چیخیں بڑھتی گئیں ۔ اور آہ و زاری میں اضافہ ہوتا گیا ۔

"میں دنیا کی چیز سنبھال کر رکھتی تھی بیگم ـــــ آج اپنی چیز دنیا کو دیے جا رہی ہوں ـــــ میری امانت ـــــ میرا دیپ !" ماں کا دل اس کے ہونٹوں پر تڑپ رہا تھا ۔

جگدیپ کا والد گھوڑی پر سے اترا ۔ ڈاکٹر اس کے ساتھ تھا ۔ پندرہ پندرہ منٹ کے وقفہ کے بعد ماں کے دو انجکشن لگائے گئے تو ماں کی چیخیں دھیمی پڑ گئیں اور اس کے بعد اس پر غنودگی طاری ہو گئی ۔

"رویا نہیں کرتے میرے چاند ـــــ" چچی نے قریب آ کر جگدیپ کو پیار دیا ۔ اور کہا ـــــ "بھگوان کا نام لو ـــــ شاید اسے ترس آ جائے ـــــ بچوں کا کہا وہ کبھی بھی نہیں ٹالتا ـــــ"

"آ میرے چاند ـــــ باہر چل ـــــ شانتی کی آنکھ لگ گئی ہے ـــــ شاید تھوڑی دیر کے لیے آرام سے لیٹی رہے ـــــ" بیگماں نے جگدیپ کا بازو پکڑ لیا ـــــ دیپ وہیں کا وہیں کھڑا رہا ـــــ جیسے وہ دھرتی اسے حرکت نہیں کرنے دے رہی تھی ۔

باہر دالان میں دیپ کے والد نے ڈاکٹر کے لیے چارپائی بچھادی تھی انہوں نے آج کی رات ڈاکٹر کو اپنے گاؤں میں قیام کرنے کے لیے کہہ رکھا تھا۔ ڈاکٹر نے باقی عورتوں کو بھی حکم دیا کہ وہ کمرے سے باہر آجائیں ۔

"لڑکا ابھی نوخیز ہے ـــــ کہیں غم دل کو نہ لگا بیٹھے ـــــ اس سے کہہ دو کہ باہر جاکر کھیلے ـــــ" بیگم بولی۔

چچی نے بڑی منت سماجت کی لیکن جگدیپ نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ جگدیپ کے کانوں میں ابھی تک چچی کے وہ الفاظ گونج رہے تھے ـــــ "بھگوان کا نام لو ـــــ شاید اسے ترس آجائے ـــــ بچوں کا کہا وہ کبھی نہیں ٹالتا ـــــ" اور جگدیپ نے سوچا کہ وہ ایک ہی جگہ کھڑا رہ کر بھگوان کے آگے گڑگڑاتا رہے گا۔

شام کا دھندلکا پھیل گیا ـــ چچی نے کمرے میں دیا جلادیا ـــــ جگدیپ دہیں کا وہیں کھڑا تھا۔

"لڑکے کو کچھ ہو نہ جائے ـــــ پتھر کی مورت بن کر کھڑا ہے ـــــ" چچی نے باہر جاکر کہا۔

"میری تو ایک نہیں سنتا ـــــ واسطے دیتے دیتے ہار چکی ہوں۔ صبح سے پانی کا ایک گھونٹ تک نہیں پیا ـــــ" چچی نے دوبارہ کہا۔

ماں بدستور بے ہوش پڑی ہوئی تھی ـــــ جگدیپ ویسے کا ویسا دریچے کی آڑ میں کھڑا ہوا تھا۔

پھر جگدیپ کو ایسا محسوس ہوا کہ ایک ننھا سا ہاتھ اسے کھینچ رہا ہے ـــــ دونوں آنکھیں بند کرکے وہ بیخودی کے عالم میں گم تھا ـــــ اسے یوں لگا جیسے بھگوان اسے مل گیا

ہو ـــــ ہربڑ اکلاس نے آنکھیں کھول دیں ـــــ فوراً اسکا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر کی طرف کھینچ رہی تھی۔
بیگماں چلی گئی ـــــ مزاج پُرسی کے لیے آتے ہوئے دوسرے لوگ بھی چلے گئے۔ چچی نے
تنور میں روٹیاں لگائیں ـــــ کسی نے آدھی کھائی اور کسی نے صرف ایک نوالہ ہی توڑا۔ چچی نے
کمرے میں آکر کہا ـــــ " بہن کا سانس اکھڑا ہوا ہے "
سب طرف کھلبلی مچی ہوئی تھی ـــــ لیکن چیخوں کی آواز اب نہیں آرہی تھی۔ جگدیپ
کو یوں محسوس ہوا ـــــ " یہ سب یونہی گھبرا رہے ہیں۔ ماں کے اب درد نہیں ہو رہا۔ میں
بھگوان کے آگے بہت گڑگڑایا ہوں ـــــ وہ بچوں کا کہا کبھی نہیں ٹال سکتا ـــــ "
نہ درد اٹھا نہ چیخوں کی آواز آئی ـــــ رات لمحہ بہ لمحہ گہری ہوتی جا رہی تھی۔
جگدیپ حیران تھا کہ ماں کے درد نہیں ہو رہا۔ لیکن یہ ماجرا کیا ہے کہ نہ تو ڈاکٹر سوتا ہے اور
نہ گھر والے سوتے ہیں۔ چچی کی ایک بار پھر آواز آئی ـــــ " کوئی کوئی سانس آرہا ہے۔ "
اس کے بعد سارے گھر کی چیخوں نے رات کا سینہ چیر کر رکھ دیا ـــــ جگدیپ
نے دیکھا کہ ہر کوئی چیخ رہا ہے اور ان کی چیخوں میں ماں کی چیخ سنائی نہیں دے رہی۔
ایک ہفتہ ہو گیا تھا ـــــ ماں کی چیخوں پر سب ہی گھبرا اٹھتے تھے۔ آج ماں کی
چیخیں بند ہو چکی تھیں مگر گھر والوں کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔
" میرے بچے ـــــ " چچی نے قریب آکر جگدیپ کو چھاتی سے لگا لیا ـــــ " اب ماں
ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملے گی ـــــ "
جگدیپ کی دونوں مٹھیاں بھنچی رہیں ـــــ بھگوان کسی کی نہیں سنتا ـــــ بچوں
کی بھی نہیں سنتا۔

گھر کے افرادیوں لیٹے ہوئے تھے جیسے سیپیوں نے اپنے بطن کا موتی کہیں گم کر دیا ہو اور اب چھلکوں کی طرح دھرتی پر گری پڑی ہوں ۔

گاؤں کا رواج تھا کہ جب کسی گھر کا کوئی فرد انتقال کر جاتا تھا تو اس گھر میں کچھ پکتا نہیں تھا — گھر کی بہوؤں کے میکے والے اس دن کی روٹی بھیج دیتے تھے ۔ جسے کچھ کھانا ہوتا کھا لیتا ۔

دیپ کی چچی جب چوکے میں روٹی پروسنے کے لیے گئی تو اس کی نظر طاق پر پڑی ۔

بہن کے ہاتھ کی پکی ہوئی دو روٹیاں — !"

ایک ہفتہ ہو گیا ہے جب بہن نے آخری بار تنور میں روٹیاں لگائی تھیں ۔ یہ دو روٹیاں بچ گئی تھیں — اٹھا کر طاق میں رکھ دی تھیں ۔ کہ صبح جانوروں کے آگے ڈال دوں گی — اس کے بعد کچھ ایسی بھگدڑ مچی کہ کسی کو کچھ ہوش نہ رہا ۔ یہ روٹیاں وہیں کی وہیں پڑی رہیں — سوکھ کر لکڑی ہو گئی ہیں — آدمی کہیں چلے جاتے ہیں مگر چیزیں پڑی رہتی ہیں ۔"

جگدیپ نے چچی کی آواز سنی تو وہ طاق کے پاس آکر کھڑا ہو گیا ۔

"میرے بیٹے کا چہرہ تو دیکھو کیسا اتر گیا ہے — آئیں تجھے روٹی پروس دوں ۔"

چچی نے کہا اور تھالی میں روٹی ڈال دی — چوکے میں دیپ کے لیے مونڈھا بچھا دیا۔

"میرے لال روٹی کیوں نہیں کھاتا — چچی نے دیپ کو خاموش بیٹھا دیکھ کہا۔

"کھاؤں گا — تو جا —"

چچی سب کے لیے تھالی میں روٹی ڈالتی رہی اور باہر دلان میں سب کے آگے رکھتی گئی۔

سب اپنے اپنے دھیان میں مگن تھے۔ دیپ نے سامنے رکھی ہوئی تھالی کو ابھی تک چھوا بھی نہیں تھا — پھر دیپ نے دیکھا کہ کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا — وہ چپکے سے اٹھا اور اس نے طاق میں سے دونوں روٹیاں اٹھا کر اپنے کرتے کے نیچے چھپالیں اور دلان سے گزر کر باہر کی گلی میں ہولیا۔

گاؤں کے باہر بیری کا بہت بڑا پیڑ تھا۔ دیپ کو جیسے وہاں پہنچنے کی بہت جلدی تھی — اس نے کرتے کے اوپر بازو رکھ کر ان دونوں روٹیوں کو مضبوطی سے اپنے سینے کے ساتھ لگایا ہوا تھا — وہ بیری تلے پہنچ گیا۔

اس نے دونوں روٹیاں کرتے کے نیچے سے نکال لیں اور بیری کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا — تاریکی بہت گہری تھی — دیپ روٹیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اندھیرے میں اسے روٹیوں پر پڑے ہوئے پھول بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے مگر وہ دیکھتا رہا — دیکھتا رہا —

پھر دیپ کو ایسا محسوس ہوا جیسے شام نہیں تھی دوپہر تھی اور وہ لڑکوں کے ساتھ مل کر بیری پر سے بیر توڑ رہا تھا — بیر توڑ توڑ کر اس نے لڑکوں کی جھولیاں بھر دیں —

اور بیر چُن چُن کر اس نے اپنی جھولی بھر لی۔

ماں کی آواز سنائی دی — صبح کا گھر سے بھوکا پیاسا نکلا ہوا ہے۔ میرا کنول کا پھول — چہرہ کتنا مرجھا گیا ہے —— ماں تجھ پر نثار ہو جائے کیا تجھے روٹی نہیں کھانی تھی —؟" اس کے بعد ماں نے اس کو باقی لڑکوں سے الگ کر کے بیری کے نیچے بٹھا لیا۔ اپنا دوپٹہ اتار کر اس کے سر پر ایک اوٹ سی کر دی اور اس اوٹ میں ماں نے مکھن سے چُپڑی ہوئی روٹی اس کے آگے رکھ دی۔

دیپ نے دانتوں سے روٹی توڑی —— روٹی مکھن کی طرح اس کے منہ میں گھل جایا کرتی تھی — آج نہ جانے کیا ہوا تھا۔ روٹی لکڑی کے ٹکڑے کی طرح اس کے منہ میں چُبھنے لگی۔

اوٹ کو ہاتھ سے پرے ہٹا کر دیپ نے ماں سے پوچھنا چاہا۔

"میں ہوں دیپ —؟" نوراں کا دوپٹہ ڈھلک کر دیپ کے منہ پر آپڑا تھا۔

نوراں نے اپنا دوپٹہ کھینچتے ہوئے کہا:

"تو —؟"

"ہاں — میں نوراں ہوں —"

"ماں کہاں ہے؟"

". . . . . ."

نوراں خاموش رہی اور پھر بولی۔

"تو رو رہا ہے — ؟"

"نہیں تو —"

"رو تو رہا ہے ــــ"

"ماں کہاں ہے ــ؟"

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

نوراں پھر خاموش رہی ــــ

"تو کہاں سے آئی ہے ــ؟"

"میں نے تجھے ادھر آتے ہوئے دیکھا تھا ــ تو اس قدر اندھیرے میں یہاں کیوں آیا ہے ــ؟"

"یہاں ابھی ابھی ماں بھی آئی تھی ــــ"

"یہاں ــ؟"

"ہاں ۔ ۔ ۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس لیے میرے سر پہ اوٹ کر دی تھی ــــ"

"تو پاگل ہو گیا ہے ذیب ــ"

"نہیں تو ــــ"

"تیری جھولی میں یہ کیا ہے ــ؟"

"روٹی ــ"

"روٹی ؟" نوراں نے ہاتھ لگا کر دیکھا ــ واقعی لکڑی کے ٹکڑوں کی طرح سوکھی ہوئی وہ روٹیاں تھیں ۔

"انہیں کہاں سے لایا ہے ــ؟"

"گھر سے ــ چچی نے کہا تھا یہ روٹیاں ماں کے ہاتھ کی پکی ہوئی ہیں ــ"

"کیا تو نے آج روٹی نہیں کھائی ــــ؟"

"ابھی ابھی ماں نے روٹی دی تھی ــــ کھانے ہی لگا تھا کہ ۔۔۔۔۔"

"تو پاگل ہو گیا ہے ۔"

"نہیں تو ۔"

"ماں تو مر گئی ہے ۔"

"میں نے ابھی ماں کو دیکھا تھا ۔"

"یہ تیرا وہم ہے دیپ ــــ یہاں تیری ماں نیرے سرپر اوٹ کرکے تجھے روٹی کھلایا کرتی تھی نا ۔؟"

دیپ نے پھر کچھ نہ کہا ۔

"تو نے آج روٹی نہیں کھائی ہے نا ۔؟"

دیپ خاموش رہا ۔

"مجھے معلوم ہے تو نے کچھ نہیں کھایا ــــ" اور پھر نوراں نے جھجکتے ہوئے کہا ــــ "تو میرے ہاتھ سے روٹی کھالے گا ــــ؟ ہمارے گھر کی روٹی ــــ" اور نوراں نے اپنی چنری میں لپٹی ہوئی نرم روٹی نکال لی ــــ "ماں کیسے پر ایندھن ٹٹول رہی تھی ۔ میں چپکے سے روٹی نکال کر لے آئی ہوں ۔"

جگدیپ ابھی تک بیری کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا ــــ اس نے منہ اٹھا کر نوراں کی طرف پہلی بار دیکھا ــــ

"تو رو رہا ہے ــــ" اندھیرے میں بھی نوراں کو دیپ کا آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ نظر آگیا اور وہ دیپ کے قریب بیٹھ گئی ــــ پھر اس نے اپنی چنری سے دیپ

کا منہ پونچھا۔

"تھوڑی سی روٹی کھالے۔"

دیپ نے نوالہ توڑ کر منہ میں ڈال لیا۔

"کسی کو بتانا نہیں ورنہ تم بھی پٹوگے میں بھی پٹوں گی۔؟"

"کیوں۔۔۔؟"

"ہم مسلمان جو ہیں۔۔۔"

"تو پھر کیا ہوا۔۔۔؟"

"کہتے ہیں خدا ناراض ہو جاتا ہے۔۔۔"

"خدا کوئی چیز نہیں۔۔۔" دیپ نے دوسرا نوالہ توڑتے ہوئے کہا۔

"یوں نہیں کہا کرتے۔"

"کیوں۔۔۔؟"

"خدا ناراض ہو جاتا ہے۔"

"ہوتا ہے تو ہو جائے۔۔۔"

"پگلے یوں نہیں کہا کرتے۔"

"میں جانتا ہوں خدا کوئی چیز نہیں۔"

"تجھے کس طرح پتہ ہے۔؟"

"اگر خدا ہوتا تو میری بات نہ سنتا۔"

"تو نے اس سے کیا کہا تھا۔؟"

"میں نے اسے کہا تھا کہ میری ماں کو مرنے نہ دیتا۔"

"کیا کبھی تو نے اسے دیکھا تھا ـــ؟ وہ دکھائی تھوڑے ہی دیتا ہے"

"کیا وہ سنتا بھی نہیں ہے"

"کیا خبر ـــ؟"

اس کے بعد وہ دونوں چپ ہو گئے ـــ ایک ایک نوالہ کر کے دیپ نوراں کی لائی ہوئی ساری روٹی کھا گیا۔

"ان روٹیوں کو کیا کرے گا ـــ؟ نوراں نے دیپ کی جھولی میں پڑی ہوئی دو سوکھی روٹیاں اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

"کھاؤں گا"

"یہ نہیں کھائی جائیں گی ـــ"

"ان کو چورا کر کے کھا لوں گا ـــ"

"نہیں دیپ ـــ"

"پھر کیا کریں ـــ؟

"انہیں بو دیں" نوراں نے سوچنے کے بعد کہا۔

"کیا روٹیاں بھی کبھی اُگا کرتی ہیں نوراں ـــ؟"

"روٹیاں تو نہیں اُگا کرتیں۔ لیکن ہم ان کے ساتھ بیروں کا بیج ڈال دیں گے یا آم کی گٹھلی ـــ بیروں یا آموں میں روٹیوں کا رس شامل ہو جائے گا"

"بات تو ٹھیک ہے نوراں ـــ" دیپ جیسے اچھل پڑا اور پھر کہنے لگا۔

"چل اُٹھ پھر ان کو بو دیں ـــ"

"اس وقت کس طرح بوئیں گے ـــ!"

"ایک گڑھا کھود لیتے ہیں —"

"کھرپا تو ہے ہی نہیں —"

"میں اپنے ہاتھوں سے گڑھا کھود دوں گی —"

"اپنے پاس تو بیج بھی تو نہیں ہے — آم بھی کوئی نہیں —"

"برگد کی ٹہنی توڑ کر لگا لیتے ہیں —"

"اس کا پھل کیسے کھائیں گے —؟"

"نہ سہی — یہ پیڑ بڑا ہو جائے گا تو اس کے نیچے گھنی چھاؤں ہو جائے گی —"

"اچھا —"

"چل اٹھ گڑھا کھودیں —"

"ہاں چل — برسات شروع ہونے والی ہے — پرسوں ماں کہہ رہی تھی

برکھا رت میں بیج ڈالا جائے تو بہت جلد اگتا ہے —!"

"کون سی جگہ اچھی ہے نوراں —؟"

"جو جگہ تجھے پسند ہو —"

"نہیں جو تجھے پسند ہو —"

"دھرم شالہ کے پیچھے بہت سی جگہ خالی پڑی ہے —"

"میں وہاں نہیں جاؤں گا —!"

"کیوں —؟"

"وہاں لوگ بھگوان کا نام لیتے ہیں —"

"پھر کیا ہوا —؟"

"میں اس کا نام نہیں سننا چاہتا۔"

"پھر تو ہی بتا بیج کہاں ڈالیں۔"

"تیرے گھر کے پیچھے بھی تو بہت سی جگہ خالی پڑی ہے۔"

"ہاں ہے تو ــــ"

"چل ــ وہاں چلیں۔"

"چل ــــ میں روز پانی دے کر اسے سینچا بھی کروں گی۔"

جگدیپ نے برگد کے پیڑ سے وہ شاخ توڑی جس کی گانٹھیں پھوٹ نکلی تھیں نوراں نے دونوں روٹیاں اٹھالیں اور جب وہ دونوں نوراں کے گھر کے پچھواڑے پہنچے تو نوراں نے کہا ــــ "تو یہیں کھڑا رہ ــــ میں چھپ کر گھر سے کھرپا اور پانی ڈول لاتی ہوں ــــ"

برگد کے ننھے سے پیڑ نے تیسرے، نوراں نے گیارھویں اور جگدیپ نے تیرھویں برس میں قدم رکھدیا تھا۔

ایک دن دیپ کی چچی سوت اٹیر رہی تھی۔ لوہے کی دو سلائیوں میں ٹنگے ہوئے دو گولے پیتل کی چھلنی میں گیند کی طرح لڑھک رہے تھے اور دونوں کی ڈوری اٹیرن پر لپیٹتے ہوئے چچی نے ایک طویل گیت چھیڑ دیا تھا:

کالے کوّے اُڑتا جا،
ڈال ڈال پہ بیٹھتا جا،
اُڑ جا میرے میکے جا،
اک نہ بتانا ماں رانی کو
دیکھ دیکھ گھڑیاں روئے گی
اک نہ بتانا میرے پتا کو
چھوڑ کچہری آجائے گا،
اور چپکے چپکے روئے گا،
اک نہ بتانا میری بہن کو

چرخہ چھوڑ کے اُٹھ آئے گی
بلک بلک کر روئے گی،

اور پھر گیت گاتے ہوئے چچی کا گلا بھر آیا۔ سامنے دیپ اور اس کا اپنا بیٹا ہیرا اسکول سے لوٹ کر اپنے اپنے بستے رکھ رہے تھے۔

"دیپا۔!"

"کیا ہے چچی۔؟"

"روٹی پڑوس دوں ؟"

"پڑوس دے چچی !"

جب چچی نے دونوں لڑکوں کے لیے تھالیوں میں روٹی رکھ دی۔ تو اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

"کیوں چچی کیا تیری طبیعت اچھی نہیں ہے ؟"

"اچھی ہے دیپ "

"نہیں چچی ... کوئی بات ضرور ہے"

چچی سسکیاں بھرنے لگی اور دیپ نے روٹی سے ہاتھ کھینچ لیا۔

"تو روٹی کھا لے پھر بتاؤں گی"

"نہیں چچی پہلے بتائے گی تو روٹی کھاؤں گا"

"نہیں تو پہلے کھا لے گا تو پھر بتاؤں گی"

دیپ نے چچی کا کہنا مان لیا اور روٹی کھا لی۔

"اب بتاؤ چچی کیا بات ہے۔؟"

پچی ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اسے اپنی گود میں بٹھا کر بولی۔
"تیرا ماموں پچھلے ایک برس سے یہ واسطے دے رہا ہے کہ تو اس کے پاس شہر جا کر پڑھے۔

"ہاں ——"

"یہاں تو تین کوس کی مسافت طے کر کے اسکول جاتا ہے —— دھوپ میں لوٹتا ہے تو تیرا چہرہ مرجھا جاتا ہے —— اب تو کون سی جماعت میں ہے —؟"

"نویں جماعت میں چچی۔"

"تو لاہور جا کر کیوں نہیں پڑھتا کہتے ہیں بہت بڑا شہر ہے —— مجھے تو میرے بھائی نے کئی بار وہاں بلوا بھیجا مگر میں نہ جا سکی —— شاید میں بھی کبھی تیرے بہانے وہاں جا نکلوں۔"

"اگر تو کہتی ہے چچی تو میں شہر چلا جاتا ہوں —— یہ کہہ کر دیپا چچی سے لپٹ گیا —" میں شہر میں چچی سے کیسے ملوں گا۔ مجھے چچی کی طرح روٹی کون کھلائے گا؟"

"مجھے موت آ جائے —" چچی کے اندر بیٹھی ہوئی جیسے ماں بول رہی تھی۔" تو میرے ہاتھ کی پکی ہوئی کب تک کھائے گا —؟"

"کیوں چچی —؟

"سنا ہے ——" چچی سے کچھ کہا نہ گیا۔

"کیا سنا ہے چچی —؟"

"سنا ہے تیرے پتا . . . . تیری نئی اماں آ جائے گی دیپ —!"

"نئی ماں —؟" دیپ بھی اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا —— اب وہ سمجھدار ہو گیا تھا۔

"دونوں بھائی الگ ہو نے ہیں دیپ ــــ تیرے پتا کی رسوئی الگ اور ہماری الگ ــــ"

دیپ خاموش رہا۔

"بھائی بھی تو ماں کی طرح ہوتی ہے ــــ اگر تو شہر جا کر پڑھے گا۔ تو آدمی بن جائیگا ــــ ان دیہات میں تو آدمی مٹی سے لڑتا ہے اور مٹی ہو جاتا ہے۔"

"بہت اچھا چچی ــــ"

"ایک بات اور بھی ہے ــ"

"وہ کیا ــــ؟"

"تیری ماں کے کپڑے میں کسی کو نہیں دوں گی ــــ وہ میری بہن کے کپڑے ہیں ــــ!"

دیپ خاموش رہا۔

"کتنے چاؤ سے اس نے ریشمی اور طلّے دار کپڑوں کا ٹرنک بھرا ہوا تھا ــــ کوئی گوٹے والا ــــ کوئی طلے والا ــــ دوپٹہ تو ستاروں سے جڑا ہوا ہے ــــ کہا کرتی تھی ــــ میں نے دوپٹہ دیپ کی دلہن کے لیے رکھا ہوا ہے ــــ جھلمل کرتی ہوئی میرے دیپ کی بہو ــــ تیرے پتا ایک چھوڑ کر سات عورتیں لے آئیں۔ میں کسی کلموہی کو ہاتھ تک نہیں لگانے دوں گی ــــ تیرے چچا سے کہہ کر صندوق کی چابی میں نے اپنے پاس رکھ لی ہے ــــ یہ رہی وہ چابی ــــ اسے سنبھال کر رکھ لے دیپ!"

"میں اسے کیا کروں گا چچی ـ تم ہی رکھ لے۔"

"یہ تیری امانت ہے دیپ ـ" اتنا کہہ کر چچی نے اس کی پیشانی چوم لی ــــ اسی رات کو دیپ کے چچا نے اپنے بھائی سے بات کر کے لاہور میں دیپ کے ماموں کو خط

لکھ دیا۔ دیپ نے اپنے کپڑے اور اپنی کتابیں حفاظت سے رکھ دیں اور اس کے والد نے اسے دو نئی قمیصیں اور دو نئے پاجامے سلوا دیئے۔

دوسرے دن رات کو دیپ نے ایک خواب دیکھا۔۔۔ اس نے اور نوراں نے مل کر برگد کا جو پیڑ لگایا تھا۔ اب وہ بلند قامت ہو گیا تھا۔ اس کے پتے نرم اور گھنے تھے۔۔۔ اس کے چھتنارے میں کہیں بھی کوئی خلا نہیں تھا۔

دیپ برگد کے نیچے بیٹھا ہوا تھا اور پھر چھم چھما چھم کرتے ہوئے کسی کے قدموں کی آواز آنے لگی۔۔۔ دیپ نے چونک کر دیکھا۔

ایک پری اس کے سامنے کھڑی تھی۔۔۔ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔۔۔ پری نے سلمے ستارے سے جڑا ہوا لباس پہن رکھا تھا اور پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"تجھے سانپ سونگھ جائے۔۔۔ کیا تو نوراں ہے۔؟"

"کیا تو ڈر گیا تھا دیپ۔؟"

"ہاں۔۔۔ تو پری بن کر کیوں آئی تھی۔؟"

"میری مرضی۔"

نوراں کی ہنسی سے دیپ کی آنکھ کھل گئی۔۔۔ اور دیپ نے دیکھا نہ وہاں برگد کا پیڑ تھا، نہ نوراں اور نہ ہی وہاں تاروں جڑا لباس تھا۔۔۔ وہ دالان میں اپنی چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔

شام کو دیکھو نوراں کے گھر گیا۔ چچی بیگماں سے ملا۔ نوراں سے ملا۔ اور پھر وہ دونوں بالٹی میں پانی ڈال کر اپنے برگد کو پانی دینے لگے۔

"تو شہر کیوں جا رہا ہے دیپ۔؟"

"وہاں پڑھوں گا ۔"

"تو بہت پڑھ جائے گا دیپ تو ہم سے بات بھی نہیں کرے گا ۔"

"کیوں ۔؟"

"تجھے ہماری باتیں پسند نہیں آئیں گی ـــــ" نوراں نے ابرق لگا کر اپنا دوپٹہ رنگا ہوا تھا ـــــ دیپا نے اس کا دوپٹہ مروڑ کر بہت سا ابرق جھاڑ دیا ـــــ!

"نوراں ۔؟"

"میرے دوپٹے کا سارا ابرق اتار دیا تو نے ـــــ"

"میں نے سوچا تھا کہ تیرے دوپٹے میں تارے جڑے ہوتے ہیں ۔"

"ہاں تجھے دن کو بھی تارے دکھائی دیتے ہیں ۔"

دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے ۔

"کیا تو برگد کو یونہی سینچتی رہے گی ۔؟"

"تجھے کیا ـــــ سینچوں یا نہ سینچوں ۔؟"

"اچھا ـــــ میری بلا سے ـــــ"

"تو شہر جا ـــــ تجھے گاؤں کے برگد سے کیا واسطہ ـــــ یہ سوکھ جائے یا جل جائے ـــــ تجھے اس سے کیا غرض ۔؟"

نوراں کے معصوم ہونٹوں پر یہ جوانی کا پہلا طعنہ تھا ۔

دوسرے دن صبح کو دیپ اپنے ماموں کے ساتھ شہر چلا گیا ۔

جگدیپ کو اس کے ماموں نے نویں جماعت میں داخل کروا دیا۔ اسکول میں پہلا دن عمر بھر کے لیے اس کے دل پر ایک گہری خراش ڈال گیا۔

اس کی جماعت کے لڑکے آپس میں کھسر پھسر کرتے، جگدیپ کی طرف دیکھتے اور پھر قہقہے سر کرتے ـــــ لڑکوں کی نگاہیں جگدیپ کو اپنے چہرے پر کانٹوں کی طرح چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں ـــــ دو تین گھنٹے گزر گئے جگدیپ کے دل میں یہ خواہش کسمسا رہی تھی کہ وہ اسکول سے بھاگ جائے، شہر سے بھاگ جائے اور کہیں دور نکل جائے۔

ڈرائنگ کے پیریڈ میں جب آدھ گھنٹہ صرف کر کے اُن لڑکوں نے اپنی اپنی کاپیاں ماسٹر کے حوالے کیں تو ماسٹر جی نے کاپیاں دیکھ دیکھ کر جگدیپ کی کاپی الگ رکھ لی ـــــ اور پھر جگدیپ کو اپنے پاس بلا کر اس کی پیٹھ پر تھپکی دی ـــــ لڑکوں نے ہونٹوں پر آئی ہوئی ہنسی دبا کر رہ گئی ـــــ صبح سے جگدیپ کے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔

ڈرائنگ کا پیریڈ ختم ہو گیا ـــــ لڑکے کمرے سے باہر آئے تو پھر کھسر پھسر شروع ہو گئی اور جگدیپ کو ایک بار پھر لڑکوں کی نگاہیں اپنے چہرے پہ کانٹوں کی طرح چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

دوسرے دن ڈرائنگ کے پیریڈ میں ماسٹر جی نے جگدیپ کی کاپی بورڈ پر لٹکا دی اور لڑکوں کو دکھلائی ـــــ لڑکوں کی ہنسی کل کی طرح ایک لمحہ کے لیے پھر دب گئی ـــ جگدیپ نے پھر اطمینان کا سانس لیا۔ مگر اب بھی اس کا دل بجھا ہوا تھا۔ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی اور وہ تنہائی میں بیٹھ کر

ڈرائنگ کا پیریڈ ختم ہوا تو لڑکے پھر قہقہے چھوڑنے لگے۔

جگدیپ روہانسا سا ہو کر بورڈ کے اوپر سے اپنی کاپی اتارنے لگا۔

لڑکے کمرے سے باہر جا چکے تھے ـــــ ماسٹر جی نے اس کو اپنے پاس بلا لیا۔

"تمہارے ہاتھ میں بڑی صفائی ہے ـــ اگر میں تمہیں بہت سا کام کرنے کے لیے دوں تو کیا کرو گے ـ؟"

جگدیپ نے کچھ نہ کہا گیا ـــــ ماسٹر جی کے ان الفاظ نے اس کے درد کو اور بھی چمکا دیا تھا۔

"اگر تم محنت کرو گے تو کسی روز مصوّر بن جاؤ گے"

جگدیپ کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا ـــ اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی ـــ اس شہر میں سب ہی بیگانے تھے وہ بھول کر اس شہر میں آ گیا تھا ـــــ لوگ اسے دیکھ کر ہنستے تھے ـــ صرف ماسٹر ہی ایک ایسا تھا جو اس پر ہنس نہیں رہا تھا۔

ماسٹر جی نے اس کی دلی کیفیت کو بھانپ لیا اور پھر بڑے پیار سے اسے اپنے پاس اسٹول پر بٹھا کر پوچھا ـــ "شہر میں تمہارا شاید جی نہیں لگا ـ؟"

"میں اس اسکول میں نہیں پڑھوں گا ـــ جگدیپ کے ہونٹ پھڑپھڑانے

لگے ــــ "مجھ پر دوسرے لڑکے ہنستے ہیں "

"اچھا ــــ میں تمہیں ایک بات بتاؤں ــــ کل سے سفید پاجامہ پہن کر آنا ــــ یہ دھاری دار پاجامہ نہ پہننا "

اب بھی جگدیپ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا ــــ وہ اپنے پاجامے کی طرف دیکھنے لگا ــــ نیا اور کورا پاجامہ تھا۔

"شہروں میں دھاری دار پاجامہ صرف رات کو سونے سے پہلے پہنتے ہیں، دن کو نہیں پہنتے ــــ یہی وجہ ہے کہ لڑکے تمہیں دیکھ کر ہنستے ہیں ــــ تمہارا کام سب سے اچھا ہے ــــ تم جماعت میں اول آؤ گے ــــ پھر دیکھنا "

جگدیپ کے بجھے ہوئے دل میں ایک چنگاری سی سلگ اٹھی ــ اس سے کچھ نہ کہا گیا۔ لیکن جب اس نے ماسٹر جی کی طرف دیکھا تو اس آنکھوں میں اس عہد و پیماں کی جھلک تھی ــــ "جتنی محنت آپ کہیں گے میں کروں گا۔

ڈیڑھ برس بیت گیا ـــــ جگدیپ نے دسویں جماعت پاس کرلی ۔ اور جب اس کے ماموں نے اسے کالج بھیجنا چاہا تو جگدیپ نے فیصلہ کن انداز میں کہا کہ وہ آرٹ سکول میں داخل ہوگا ۔

ماموں کا جی چاہتا تھا کہ ان کے خاندان میں کوئی لڑکا بی اے پاس ہو ۔ اسے جگدیپ سے بڑی امیدیں تھیں لیکن جگدیپ کے ارادے نے اس کے حوصلے پست کر دیئے گاؤں سے جگدیپ کے والد کا خط بھی آیا کہ تصویریں بنانا سیکھ کر جگدیپ کے پلے کیا پڑے گا ـــــ کالج میں پڑھے ـــــ شاید کبھی افسر بن جائے ـــــ ورنہ گاؤں واپس چلا آئے ـــــ اپنی زمین پر کام کرے ۔

جگدیپ کے پاس امید کی صرف ایک ہی کرن تھی ـــــ اسکول کا وہ ڈرائنگ ماسٹر ـــــ !

اس کے پاس جاکر جگدیپ نے اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا ۔ اور اس سے التجا کی کہ وہ اس کے ماموں کو سمجھائے ۔

تین دن کی مسلسل بحث اور تکرار کے بعد ماموں بددل ہوکر جگدیپ کو آرٹ اسکول میں لے گیا ۔

"لو یہ گولڈ سمتھی ہے سنار کا کام! یہ بلیک سمتھی ہے۔ لوہار کا کام۔! یہ کارپینٹری ہے ــــ بڑھئی کا کام ــــ یہ ہے ٹیکسٹائل ڈیزائن ــــ جیسے ہمارے گاؤں میں کپڑے پر چھاپے کا کام ــــ اس کا ماموں کہہ رہا تھا۔ جگدیپ مسکرا رہا تھا ــــ ماموں نے مجسمہ سازی کے شعبے کی طرف بڑھ کر کہا ــــ" جیسے کمہار برتن بناتا ہو ــــ دیپ اگر اتنے برس ضائع کر کے تجھے لوہار یا بڑھئی ہی بننا ہے تو۔۔۔۔"

"آپ فکر نہ کریں ــــ میں کمرشل پینٹنگ کا کورس ــــ کروں گا۔"

"بعد میں لوگوں کے سائن بورڈ ہی بنایا کرے گا۔؟"

اس کا ماموں مایوس ہو چکا تھا ــــ جگدیپ خاموش رہا ــــ اور اس نے کمرشل پینٹنگ کے شعبے میں اپنا نام لکھوا دیا۔

گاؤں سے جگدیپ کے والد کے دو تین خطوط آئے۔ جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ اب ان کی صحت گرتی جا رہی ہے اور جگدیپ چھٹیوں میں آ کر ان سے مل جائے چچا کا خط بھی آیا تھا ـــــ اس خط میں اس کی چچی نے لکھوایا تھا ـــــ "کیا تو آتنا ہی سنگدل ہو گیا ہے ـــــ کبھی آ کر منہ نہیں دکھایا"

گذشتہ چھٹیوں میں بھی اس نے سوچا تھا کہ وہ گاؤں جائے گا۔ کئی بار اس نے ارادہ بھی کیا۔ لیکن جب بھی وہ اپنے ٹرنک میں کپڑے ڈالتا تو اس کے دل کو ایک ٹیس اٹھتی ـــــ اس نے سنا تھا کہ اب اس کے گھر کے دالان میں ایک اونچی دیوار اٹھا دی گئی تھی ـــــ ایک طرف چچی رہتی تھی۔ اور دوسری طرف اس کی نئی ماں! لوگ کہتے تھے کہ اس کا والد دھرم شالہ میں پھیرے لیکر ایک عورت گھر لے آیا تھا جسے سب چھوٹی شاہنی کہتے تھے۔

جگدیپ جب گاڑی میں سوار ہوا تو بڑی دیر تک اسے اپنے گھر کے دلان میں اٹھی ہوئی دیوار دکھائی دیتی رہی ـــــ پھر اس دیوار کی جگہ برگد کے پیڑ لہلہانے لگے ـــــ ریل گاڑی اسے گاؤں کے قریب لیے جا رہی تھی۔

اس نے والد کے قدموں میں سر رکھ دیا ـــــ چچا سے بغلگیر ہوا اور پھر چچی نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

"تو اب جوان ہو گیا ہے ـ!"

"اور تو بہت دُبلی ہوگئی ہے چچی ـــــ؟"

"یہ میری جوانی کے دن تو نہیں ہیں ـــــ"

"ہیرا کہاں ہے ـ؟"

"ابھی کنوئیں سے آتا ہوگا ـــــ اس نے بڑا قد نکال لیا ہے ـــــ تیرے کندھے کے برابر آتا ہے"

"اور چچی . . . ."

"آ تجھے چھوٹی شاہنی کے پاس لے چلوں ـــــ باہر نہیں نکلتی ـــــ تجھ سے ڈرتی ہے"

"مجھ سے ـ؟"

"ہاں ـــــ غریب گھر کی لڑکی ہے ـــــ ذرا ذرا سی بات پر ڈر سکتی ہے"

جگدیپ کے سینے پر پڑا ہوا بوجھ جیسے چچی نے ہلکا کر دیا ـــــ اس نے اندر جا کر چھوٹی شاہنی کے پاؤں چھوئے ـ

"جیتے رہو ـــــ" اور چھوٹی شاہنی نے جھکتے ہوئے جگدیپ کی پیٹھ پر پیار سے ہاتھ پھیرا ـــــ "کیا تم مجھ سے ناراض ہو ـــــ؟" چھوٹی شاہنی نے دھیمی آواز سے پوچھا ـ

"نہیں تو ـــــ" دیپ جیسے چونک پڑا ـ

"تم گاؤں کیوں نہیں آتے تھے ـــــ؟"

"سوچ رہا تھا کہ کچھ پڑھ لوں ـــــ کچھ سیکھ لوں ـــــ" دیپ نے کہا ـ مگر وہ حیران تھا ـ اسے اس قسم کے سوال کی توقع نہیں تھی ـ

"میرا کوئی قصور نہیں دیپ ـــــ" چھوٹی شاہنی نے پھر آہستہ سے کہا ـ

"نہیں تو ـــــ" جگدیپ نے ایک بار پھر حیران ہو کر چھوٹی شاہنی کی طرف دیکھا ـ گزشتہ برس جگدیپ چھوٹی سیٹھانی سے ملنے سے ڈرتا رہا تھا ـ لیکن آج اس نے

دیکھا کہ چھوٹی شاہنی شاید اس سے بھی زیادہ ڈرتی تھی ۔

جگدیپ نے کھانا کھایا اور پھر دو گھنٹے آرام کرنے کے بعد اس نے کہا:

"میں ذرا باہر ہو آؤں ۔"

"ابھی تو بہت دھوپ ہے ــــ تھوڑی دیر بعد جانا ــــ" نئی شاہنی نے پیار سے کہا ــــ اگر اس کی ماں ہوتی تو وہ شاید اس کا کہا ٹال دیتا لیکن چھوٹی شاہنی کے سامنے اس سے انکار نہ ہوا اور وہ چارپائی پر لیٹا رہا ۔

"تجھے یاد ہی نہیں رہا ــــ نوراں دو بار آچکی ہے ــــ تم سوئے پڑے تھے ۔"

"نوراں ــ ؟"

"کیوں کیا یاد نہیں رہا ــــ کہتے ہیں بچپن میں تو اس کے ساتھ کھیلا کرتا تھا ۔"

"نوراں آئی تھی ــ ؟"

"دو بار آچکی ہے ــ"

"مجھے جگا لیا ہوتا ــ"

"میں سمجھی ــ تم تھکے ہوئے ہو ــــ اور وہ جھجھکتی بھی بہت تھی ــ اب تم جوان ہو گئے ہو نا ــ !

"اچھا میں ذرا چچی بیگماں کے گھر تک ہو آؤں ــــ" اور جگدیپ اٹھ بیٹھا ۔

"چچی ــ چچی ــ !" جگدیپ نے چچی بیگماں کے دروازے پر جاکر دستک دی ۔

"خدا تجھے سلامت رکھے ــ میں قربان جاؤں ــــ" بیگماں جیسے پھولی نہیں سما رہی تھی ۔

"خیریت سے تو ہو چچی ــ ؟"

"تجھے دیکھ کر بہت خوش ہوں ــــ ذرا ٹھہر ــ میں چارپائی پر چادر بچھا دوں ۔"

"کیا پہلے بھی تو چادر بچھایا کرتی تھی ــــ اب میں کوئی اور تو نہیں ہوں ۔"

"اب خدا کے فضل سے نوجوان ہو گیا ہے ــــ سنا ہے اب تو نہایت اچھی تصویریں بنا لیتا ہے۔"

"تیری تصویر بناؤں چچی ــ؟"

"اب اس بڑھاپے میں میری کیا تصویر بنائے گا ــ اب تو چہرے پر جھریاں پڑ گئی ہیں ــ"

"میں جھریاں بھی بنا دوں گا ــ" دیپا نے کھل کر ہنستے ہوئے کہا۔

"بتا میں تیری کیا خاطر و مدارات کروں ــ"

"گھر میں جو کچھ بھی پکا ہے کھلا دو۔"

"میرے گھر کی پکی ہوئی کوئی چیز تو بھلا کب کھائے گا۔"

"کبھی کھلا کر بھی دیکھا ہے چچی ــ؟"

"میں اگر کھلاتی تو کیا کھا گیا ہوتا ــ؟"

"کیوں نہ کھا گیا ہوتا ــ تم نے کبھی کچھ کھلایا بھی ہے ــ نوراں مجھے کھلایا کرتی تھی۔"

"جانے بھی دے۔"

بیگماں نے ابھی جانے بھی دے۔ کہا ہی تھا کہ دروازے کے پیچھے سے کسی کے کھلکھلانے کی آواز آئی۔

"وہ دیکھ ــ دروازے کے پیچھے کھڑی قہقہہ لگا رہی ہے ــ اری ذرا باہر تو نکل ــ وہی دیپ تو ہے ــ کوئی اور تو نہیں ــ" اس کے بعد ماں نوراں کا بازو پکڑ کر اسے باہر لے آئی۔

"کوئی گھر آتے ــ تو کیا اس طرح کیا کرتے ہیں۔!"

"ابھی میں تیرے گھر نہیں گئی تھی ۔"
"تو نے مجھے جگایا کیوں نہیں ۔ ؟"
"میں نے سوچا تو کہیں ناراض نہ ہو جائے ۔"
"تجھ سے ناراض ہو جاتا ۔ ؟"
"ناراض ہی تو تھا جب ہی تو گاؤں نہیں آتا تھا ۔"
"کیا تو نے مجھے کبھی بلوا بھیجا تھا ۔ ؟"
"کیوں نہیں ۔"

اب دیپ کے پاس کوئی جواب نہ رہا ـــ نوراں نے کبھی خط نہیں لکھا تھا۔ کبھی کوئی پیغام نہیں بھیجا تھا۔ پھر بھی وہ یہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ اس نے کبھی اس کو بلوا نہیں بھیجا تھا ـــ دیپ نے ڈھٹائی کے ساتھ کہا ـــ مجھے تو نے کونسا خط لکھا تھا ؟"

نوراں خاموش رہی لیکن اس نے کچھ اس انداز سے دیپ کی طرف دیکھا وہ شرمندہ ہو گیا ۔

"کیا برگد کو پانی بھی دیا کرتی ہے ۔ ؟"
"تجھے کیا ۔ ؟"

دونوں ہنس پڑے جیسے صلح ہو گئی ۔

"بیا اسے جا کر دیکھ ـــ دن میں دو بار پانی دیا کرتی تھی ـــ" ماں نے کہا اور پھر وہ دیپ کی طرف منہ کر کے بولی ـــ "جب میں اسے پانی کا گھڑا لانے کیلئے کہتی تو کانوں میں انگلیاں ڈال لیا کرتی تھی لیکن برگد پر دو دو گھڑے پانی کے انڈیل دیا کرتی تھی ۔

نوراں اور دیپ جب برگد کے نیچے گئے تو دیپ نے برگد کے نرم پتے اپنے ہاتھ

میں لے کر کہا ــــ تیرا برگد کتنا بڑا ہو گیا ہے۔"

"جیسے یہ برگد تیرا نہیں ہے۔"

دیپ نے آنکھیں بند کر لیں ــــ ایک بار تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے برگد کی چھاؤں میں ماں کے ہاتھ کی چھاؤں ملی ہوئی تھی ــــ وہ رات دیپ کی آنکھوں میں گھوم گئی جب وہ ماں کے ہاتھوں کی پکی ہوئی روٹیاں اپنی جھولی میں لیکر بیری کے نیچے بیٹھا ہوا تھا ــــ ماں کے دوپٹے کی اوٹ ــــ نوراں کی چنری ــــ

اور پھر نوراں کی چنری میں ستارے جڑے گئے ــــ دیپ نے چونک کر پوچھا ــــ "نوراں اگر تو سر پر ستاروں والی چنری اوڑھ لے تو میں تیری ایک تصویر بناؤنگا۔"

"میرے پاس ستاروں والی کوئی چنریا نہیں ــــ" نوراں نے دھیمے سے کہا۔

جگدیپ کو ماں کا صندوق یاد آ گیا ــــ اور پھر چچی کے پاس رکھی ہوئی اس صندوق کی چابی یاد آئی۔

"اگر میں وہ چنری لا دوں تو ــــ"

"کہاں سے لائے گا؟"

"ماں کے صندوق میں پڑی ہوئی ہے۔"

"وہ تو چھوٹی شاہنی نے لی ہوئی ـ ؟"

"نہیں چچی نے اسے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔"

"تو یوں ہی تصویر بنا لے۔"

"نہیں نوراں ــــ میں وہ چنریا لاؤں گا۔"

"کوئی دیکھ لے گا۔"

"تو ہمارے گھر آ جا ــــ اوپر کی منزل خالی پڑی ہے ــــ وہاں کوئی بھی نہیں

دیکھ سکے گا ـــــ میرے رنگ اور برش بھی وہیں پڑے ہیں"۔

"بہت اچھا"

"کل سویرے آجانا"

اس رات کو دیپ نے چچی کے یہاں کھانا کھایا اور پھر چچی کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔

" دنیا میں ماں کی جگہ تو کوئی بھی نہیں لے سکتا لیکن چھوٹی شاہنی دل کی بُری نہیں ہے دیپ۔"

"بُری تو نہیں "

" تیرے پتا نے تیرے چچا کے ہاتھ سندیسہ بھیجا ہے کہ تجھ سے کہا جائے چھوٹی شاہنی کی طرف سے اپنے دل میں کوئی میل نہ لانا"۔

"میرے دل میں تو کچھ بھی نہیں ہے چچی"

"میں جانتی ہوں دیپ ـــــ لیکن تیرے پتا ڈرتے تھے ـــــ لڑکا جوان ہو گیا ہے ـــــ کہیں دل میں کوئی گرہ نہ باندھ لے"۔

"اس بے چاری کا کیا قصور ہے چچی"

" مگر عمر کا بہت فرق ہے دیپ ـــــ کوئی جوڑ نہیں ـــــ بھگوان کی کرپا سے سیٹھ جی کی عمر کافی ہے ـــــ تو بھی تو بڑھاپے کی اولاد ہے ـــــ اور نئی شاہنی

کی بھرپور جوانی ہے ــــ نہ کسی کے بھلے میں ــــ نہ کسی کے برے میں ــــ ایسا معلوم ہوتا ہے ۔ جیسے اس نے اپنا من مار لیا ہو۔"

"خوش نہیں رہتی -؟

"خوش تو ہے ــــ بھرا پڑا گھر ہے ــــ غریب گھر کی لڑکی تھی ــــ اس کے باپ نے سیٹھ جی کے یہاں اپنی زمین رہن رکھی ہوئی تھی ــــ کہتے ہیں سیٹھ جی نے زمین بھی لوٹا دی اور اس کے باپ کو کچھ نقد بھی دے دیا ــــ

"مگر جوڑ کوئی نہیں ہے دیپ ــ!"

"ایک بات کہوں چچی ـ"

"کیا ــــ"

"تیرے پاس صندوق کی چابی ہے نا ـ ؟"

"میرے پاس تیری امانت پڑی ہے ـ"

"وہ کپڑے اس سے نکال دے ـ"

"نہیں دیپ ــــ وہ کپڑے تو جب بھگوان کی دیا سے دُلہا ــــ"

"میری بات تو سن چچی ـ"

"تیری ماں کہا کرتی تھی ـ"

"اس وقت تک نوان کپڑوں کا رواج نہیں رہے گا "

"کیا تو بوڑھا ہو کر شادی کرے گا ـ ؟"

"نہیں ــــ شہروں کی لڑکیاں اب ایسے کپڑے نہیں پہنتی ہیں ـ"

"کیا تو کسی شہر کی لڑکی سے شادی کرے گا ۔ ویسے تیری بات تو ٹھیک ہے

اب تجھے گاؤں کی لڑکیاں پسند نہیں آسکتیں ۔ کیوں دیپ — ؟ یہ جو تو نے پتلون پہن رکھی ہے تجھے بہت پھبتی ہے — صاحب معلوم ہوتا ہے ۔

"اچھا تو چابی دے دو" — دیپ ہنسنے لگا ۔

"اس میں ایک دوپٹہ ہے — ستاروں والا — ستارے یوں جڑے ہوئے ہیں کہ اس میں تل دھرنے کی جگہ نہیں ہے ۔"

"وہ دوپٹہ میں نکال لوں گا ۔"

"چاندی کی جھانجریں ہیں —"

"وہ نکال لوں گا ۔"

چچی نے چابی لاکر اسے دیدی اور جگدیپ گھر جاکر عقبی کمرے میں وہ صندوق کھولنے لگا ۔ صندوق کو ہاتھ لگاتے ہی دیپ کے دل میں کوئی چٹکیاں لینے لگا — ماں کے ہر ایک لمس کو جیسے اس نے اپنے گلے سے لگا رکھا تھا — دیپ کپڑوں کی تہہ نہ ٹٹول سکا — اس نے چچی کو بلا بھیجا اور چچی نے آکر ستاروں والا دوپٹہ اور چاندی کی جھانجریں نکال کر اوپر کی منزل میں دیپ کے ٹرنک میں رکھ دیں ۔ اور باقی صندوق جوں کا توں بھرا رہنے دیا ۔

دیپ نے چھوٹی شاہنی کو بلوایا اور چابی اس کے حوالے کر دی ۔

"رہنے دو دیپ — گوٹے کناری والے کپڑے پہننے کی اب میری عمر کہاں ہے ۔"

دیپ نے حیران ہو کر چھوٹی شاہنی کی طرف دیکھا — اس کی عمر بمشکل بیس برس کی تھی ۔ وہ زیادہ سے زیادہ بائیس برس کی ہوگی وہ کہہ رہی تھی کہ گوٹے کناری والے کپڑے پہننے کی اب عمر کہاں ہے ۔

"تیری عمر کیوں نہیں — تیرے کھانے پینے کا وقت ہے — لڑکے کی بات رکھ لے یہ صندوق وہ خوشی سے تجھے دے رہا ہے — پاس ہی کھڑی ہوئی بھی نے کہا اور چھوٹی شاہنی نے چابی لے لی۔

صبح جگدیپ ابھی سویا ہی پڑا تھا کہ نوراں آ پہنچی — آج نوراں نے دیپ کو جگایا۔

"کیا شہروں میں لوگ صبح کو اتنی دیر کے بعد جاگتے ہیں —؟"

"تو ہے نوراں —؟"

"تجھ سے کہا تھا صبح سویرے آ جانا —"

"صبح ہی تو ہے"

"میں واپس چلی جاتی ہوں — شہروں کی صبح شاید دوپہر کو ہوتی ہے"

"نہیں نوراں — یہاں بیٹھ جا — میں پانچ منٹ میں تیار ہو جاؤں گا"

دیپ نے جب تیار ہو کر اپنے رنگ اور برش نکالے تو ستاروں والا دوپٹہ بھی نکال لیا۔

"میں یہ دوپٹہ نہیں اوڑھوں گی —"

"کیوں —؟"

"اسے اوڑھ کر تو میں —" اس کے چہرے پر حجاب کی سرخی دوڑ گئی۔!

"ذرا سی دیر کے لیے اوڑھ لو گی تو کیا ہو جائے گا —؟"

"کچھ نہیں"

"تو پھر اوڑھ لو —"

کچھ لمحوں کے لیے دونوں خاموش رہے اور پھر نوراں نے دوپٹہ اپنے سر پر ڈال لیا۔

آج سے کئی برس پہلے دیپ نے جو خواب دیکھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں لرزنے لگا۔

ردیپ نے جب اپنے برش کو رنگ میں ڈبویا تو اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

تصویر بنانے کے لیے ....

"کیوں —— بنا تو رہا ہوں"

"دوپٹہ کی طرف دیکھتا چلا جا رہا ہے اور تصویر تو نہیں بنا رہا ہے"

"نہیں نوراں —— تارے اتنے چمک رہے ہیں کہ میری آنکھیں چندھیائی جا رہی ہیں"

"دوپٹہ اتار دوں —؟"

"نہیں —— نہیں —— یونہی بیٹھی رہ ——"

دیپ نے جیسے تیسے تصویر تو بنائی مگر اسے اطمینان نہ ہوا —— وہ جانتا تھا کہ ابھی

ں کے فن میں پختگی نہیں آئی —— نوراں نے دوپٹہ اتار کر اسے تہہ کیا اور پھر اسے

بپ کے ٹرنک میں رکھ دیا۔

"یہ دوپٹہ تو لے جا نوراں —— تجھے بہت پھبتا ہے"

"ہش ——" اور نوراں بھاگ گئی۔

چھٹیاں ختم ہو گئیں اور جس روز دیپ کو شہر واپس جانا تھا۔ چچی بیگماں نے اس کے

ں آ کر کہا —— "چھ مہینے تک نوراں کی شادی کرنی ہے —— خط لکھوں تو آئے گا —؟

"نوراں جائے گی تو ضرور آؤں گا"

جگدیپ سب سے رخصت ہو کر گاڑی پر سوار ہوا تو اس رات کو گاڑی میں سوئے

ئے اس نے ایک سپنا دیکھا کہ کوئی اس کے ٹرنک میں سے تاروں والا دوپٹہ نکال

اس کے ستارے ادھیڑ رہا تھا۔

ابھی چند ہی مہینے گزرے تھے کہ نوراں کی شادی کی اطلاع موصول ہوئی۔ اس نے شہر کے تمام بازار کھنگال ڈالے مگر نوراں کو تحفہ دینے کے لیے جگدیپ کی نظر پر کوئی چیز نہیں چڑھتی تھی۔ جگدیپ اپنے ہاتھ سے کئی بار اسے دور ہٹاتا لیکن گھوم پھر کے تاروں والا دوپٹہ اس کی آنکھوں کے آگے آجاتا ــــ وہ لینے پر بھی سنبھلا اٹھا اور پھر اس نے گاؤں جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

مہینوں کی ایک لمبی قطار گذر گئی ــــ جگدیپ نے کمرشل آرٹ کے کورس کے تین سال پورے کر لیے اور فائن آرٹس کا دو سال کا کورس شروع کر دیا اب اس کے رنگوں سے زندگی جھلکنے لگی تھی۔

اس کے بعد یہ خبر آئی کہ سیٹھ جی کا انتقال ہو گیا ــــ ویسے بیمار چلے آرہے تھے۔ اسی لیے ان کی موت سے پہلے کسی نے جگدیپ کو کوئی خاص بات نہیں لکھی تھی ــــ کسی کو یہ توقع بھی نہیں تھی ــــ جس رات کو انہوں نے وفات پائی اس دن صبح کو اچھے بھلے تھے ــــ باہر کھیتوں میں بھی گئے تھے ــــ دوپہر کو انہوں نے کچھ نہ کھایا۔ کہنے لگے ہاتھ پاؤں ٹوٹ رہے ہیں اور دل ڈوب رہا ہے۔

جگدیپ کو ان کے انتقال کے متعلق تار ملا اور وہ اسی رات کو گاڑی پر سوار ہو گیا۔

تیرے سامنے ــــ ہم بہت شرمندہ ہیں دیپ ــــ موت نے ہمیں ایک دن کی بھی فرصت نہ دی کہ ہم تجھے مطلع کرتے ــــ"، جگدیپ کو اپنے گلے سے لگا کر چچی خوب روئی۔
جگدیپ نے چھوٹی شاہنی کی طرف دیکھا ــــ اسکا اترا ہوا چہرہ اور بھی اتر گیا تھا۔
جگدیپ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے اندر کا سونا پن گہرا ــــ اور بھی گہرا ہو گیا تھا۔
جگدیپ کو کم از کم تیرہ دن کے لیے گاؤں میں رہنا تھا۔ گرمیوں کی چھٹیاں بھی شروع ہو گئی تھیں۔ لہذا جگدیپ شہر واپس نہ گیا۔

جگدیپ کے ساتھی لڑکے اب گاؤں کے سجیلے جوان بنے ہوئے تھے۔ وہ کبھی کبھی ان میں جا بیٹھتا لیکن اس کی کسی کے ساتھ گاڑھی نہیں چھنتی تھی۔ لیکن وہ کنوؤں پر بیٹھے۔ کھیتوں میں کام کرتے اور ہنستے گاتے ہوئے اسے اچھے لگتے تھے ــــ اس نے کئی خاکے بنائے لیکن ہر ایک شلعم کو وہ سوچتا تھا کہ آنے والی کل کے دامن میں بھی اس کے لیے کوئی دعوت نہیں ہے۔

چچی بیگماں کے گھر بھی وہ تین بار گیا تھا ــــ نوراں اپنے سسرال میں تھی۔ اور چچی اسے بڑے فخر کے ساتھ بتاتی رہی کہ کیسے اس نے نوراں کے لیے گہنے بنوائے کیسے اس نے اپنی شادی کے جوڑوں پر کشیدہ کاڑھا۔ ایک نوراں پر ایک نیا روپ آیا، کیسے بارات آئی، کتنا اس کا زیور آیا اور ان کے گھر کتنی دیگیں چڑھائی گئیں۔

جگدیپ بیگماں کے گھر کے پچھواڑے بھی جا [illegible] ــــ اپنے برگد کو دیکھتا رہا۔ نوراں نے سینچ سینچ کر اسے پالا تھا اور اب وہ اس [illegible] جوان ہو گیا تھا کہ پانی کا محتاج رہا تھا ــــ اس کے پتوں نے ایک چھت بنا دی تھی ــــ جگدیپ اس کی چھاؤں تلے لیٹے کاغذوں اور رنگوں کو ادھر اُدھر بکھیر دیتا ــــ ان کے کانوں میں کبھی کبھی آواز آتی ــــ "تو برگد کو سینچا کرے گی۔ نا نوراں ــ؟

"تجھے کیا ــــ سینچوں یا نہ سینچوں ــ"

"چلو مجھے کچھ بھی نہ سہی ۔"

"تو شہر جا ــ تجھے گاؤں کے برگد سے کیا واسطہ ـــــ سوکھ جائے یا جل جائے تجھے اس سے کیا غرض ۔!"

اور پھر اس کے جی میں آتا وہ کہے ــ "تو نے الٹی بات کہی تھی نوراں ـــ گاؤں کے برگد سے تجھے کیا واسطہ ـــ چاہیئے یہاں کو روز آکر بیٹھا رہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اس کے بعد "تجھے کیا واسطہ" کا جملہ جگدیپ کے دل میں ایک ہلچل پیدا کر دیتا ۔

چھٹیاں ابھی اب ختم ہونے والی تھیں ـــ ایک روز جگدیپ کے آگے روٹی رکھتے ہوئے چھوٹی شاہنی کا گلا بھر آیا ـــــ "تو شہر چلا جائے گا دیپ ۔؟"

"شہر ـــ ہاں جانا ہی پڑے گا ۔"

"تو اب شادی کیوں نہیں کر لیتا ۔"

"پھر کیا ہوگا ـــ جگدیپ ہنس پڑا ۔

"نہیں ـــ بات یہ ہے کہ ـــ" چھوٹی شاہنی اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی ۔ اس کی خاموشی میں کچھ ایسا درد تھا کہ جگدیپ کی ہنسی اس کے ہونٹوں پر جم گئی ۔

"کیا بات ہے چھوٹی شاہنی ـــ" جگدیپ کی آواز کچھ اتنی گمبھیر تھی کہ اس نے چھوٹی شاہنی کے دل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ۔

"تو مجھے چھوٹی شاہنی کیوں کہتا ہے ـــ میں تیری ماں ہوں ــ"

"یوں ہی کہہ رہا ہوں ـــ سب ہی چھوٹی شاہنی کہتے ہیں ـــ اس لیے میں بھی کہہ دیتا ہوں ۔"

"اور دیپ! ــــ مجھے بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں تیری ماں نہیں ہوں۔
ــــ تو مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح معلوم ہوتا ہے۔"

جگدیپ خاموش رہا۔ مگر اس نے چھوٹی شاہنی کی طرف کچھ اتنے لگاؤ سے دیکھا جیسے دونوں نے بہن بھائی کا رشتہ قبول کر لیا ہو۔

"اچھا تو یہ بتاؤ شادی کر کے کیا کروں ــ!"

چھوٹی شاہنی نے کوئی جواب نہ دیا۔ جیسے اس میں اب بولنے کی ہمت ہی نہیں تھی۔

"تمہیں کسی بات کی کمی نہیں محسوس ہوگی۔"

"کمی تو کوئی نہیں دیپ ــ مگر اب میرا جینے کو جی نہیں چاہتا ــــ" چھوٹی شاہنی کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے، مگر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اس کے اندر زندگی کا شعلہ بجھتا جا رہا ہے۔

"ایک بات پوچھوں۔"

"تجھ سے میں کچھ نہیں چھپا سکتی دیپ۔"

"اب تو خیر تم پر قہر نازل ہوا ہے لیکن جب میں پچھلی بار یہاں آیا تھا اس وقت بھی تم ــــ" اس سے آگے جگدیپ کو کچھ کہنے کے لیے سوجھا ہی نہیں۔

"اس وقت بھی میں زبردستی زندہ تھی ــــ" چھوٹی شاہنی ناخنوں سے مٹی کریدنے لگی ــــ

"میں بھی یہی کہنا چاہتا تھا۔"

"یہ سچی بات ہے دیپ۔"

"شادی تمہاری مرضی سے نہیں ہوئی تھی ـ؟" جگدیپ نے ذرا رک کر پوچھا۔

کیسی مرضی ــــ اور کس کی مرضی ــــ میرے باپ نے مجھے بیچ دیا ۔۔۔
میرا تو اس وقت بھی یہی جی چاہتا تھا ۔ کہ میں کنوئیں میں چھلانگ لگا دوں ــــ
لیکن میں نے خود ہی آپ سے کہا ــــ مر جاؤنگی تو بھی مردہ ــــ زندہ رہوں گی
تو بھی مردہ ــــ کوئی بات نہیں جیتے جی مر جاؤں گی ــ باپ کا ہاتھ تو تنگ نہیں
رہے گا ــــ میرا ایک چھوٹا سا بھائی تھا ــــ ہو بہو تجھ جیسا معصوم ــــ اس کے منہ
کی طرف دیکھتی اور سوچتی ۔ کوئی بات نہیں ــــ اس کے سر سے قرضے کا بھاری بوجھ
اُتر جائے گا ــــ اب وہ خوشحال ہیں ــــ اپنے گھر میں مزے سے ہیں ۔ سکھی ہیں ۔"
جگدیپ کو ایسا محسوس ہوا کہ صرف اس کے دل میں ہی غلاہر نہیں تھا ۔ بلکہ دنیا میں
ایسے کتنے ہی لوگ تھے جن کے سینوں میں بڑے بڑے گھاؤ تھے ۔

"اب تجھ سے اپنے آپ کو گھسیٹا نہیں جا رہا دیپ ــ"

جگدیپ سے کچھ بھی نہ کہا گیا ــــ چھوٹی شاہنی ہی نے کچھ دیر کے بعد کہا ۔
" دل تو میرا اسی دن کنوئیں میں ڈوب گیا تھا ــــ اب یہ تن باقی ہے ۔ مجھ سے اس
کا بوجھ نہیں اٹھایا جاتا ۔"

اس کے بوجھل سکوت کو کوئی بھی نہ توڑ سکا ــــ جگدیپ ساری شام کھیتوں
کی مینڈھ پر بیٹھا رہا ۔ جہاں کہیں کنواں نظر آتا اسے ایسا معلوم ہوتا جیسے اس کنوئیں
میں چھوٹی شاہنی نے چھلانگ لگا دی ہو ــــ وہ پاگلوں کی طرح اس کنوئیں میں جھانکنے لگتا ۔
جگدیپ رات گئے گھر لوٹا ــ چھوٹی شاہنی چولھے پر توا رکھ کر اس کا انتظار کر
رہی تھی ــــ جگدیپ چوکے میں جا بیٹھا تو چھوٹی شاہنی نے گرم گرم روٹی اتار کر تھالی
میں ڈال دی ۔

"شہر میں تو کوئی تنور ہیں۔ روٹیاں نہیں پکوا تا۔ تو چولہے کی روٹیاں کھاتا ہوگا — میں تجھے چولہے کی روٹی پکا دیا کروں گی۔"

بہت دن ہوئے چھوٹی شاہنی نے اس سے یہ بات کہی تھی — اس دن کے بعد وہ جگدیپ کے لیے پتلی پتلی روٹیاں پکایا کرتی تھی۔

آج جگدیپ کا روٹی کھانے کو جی نہیں چاہتا تھا — وہ باتیں کرنا چاہتا تھا — مگر وہ دل بہلانے کے لیے روٹی کھاتا رہا۔

کھانا ختم ہوا — چھوٹی شاہنی نے برتن سمیٹے — دہی کے لیے دودھ رکھا۔ جھاڑ پونچھ کر جگدیپ کا بستر لگایا اور پھر ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر کے وہ اپنی چارپائی پر لیٹ گئی۔

"کیا نیند نہیں آرہی دیپ — ؟"

"نہیں کوئی کہانی سنا دو —" جگدیپ نے بچوں کی طرح التجا کی۔

"مجھے تو سب کہانیاں بھول گئی ہیں۔"

"کسی پری کی کہانی سنا دو۔"

"کہاں ہوتی ہیں یہ پریاں دیپ — لوگوں نے یونہی باتیں بنا رکھی ہیں۔"

"بچپن میں تو کہانی سنایا کرتی ہوگی۔"

"کہانیاں سب ہی چھوٹی ہوتی ہیں دیپ — !"

"اچھا میں ایک کہانی سناتا ہوں۔"

"سناؤ۔"

"ایک لڑکی تھی — نہایت ہی خوبصورت — اس کے والدین کا جی چاہا کہ

وہ اس لڑکی کو بیچ کر ڈھیروں روپیہ حاصل کر لیں "۔

"چل ہٹ ــــ"

"سنو تو سہی ــــ اور پھر جب اس لڑکی نے یہ بات سنی تو وہ آگ بگولا ہو گئی ــــ کنوئیں میں چھلانگ لگانے کے لیے چل دی ــــ جب وہ کنوئیں میں کودنے لگی تو پیچھے سے آ کر ایک پری نے اسے پکڑ لیا "۔

"پریاں کہاں ہوتی ہیں دیپ ــــ پریاں بھی جھوٹی ہوتی ہیں ــــ ویسے تیری ایک بات سچی ہے "۔

"کون سی ــ ؟"

"جس رات کو میں کنوئیں میں چھلانگ لگانے گئی تھی ــ میرے پیچھے پیچھے ــ"

"کون آیا تھا ــ ؟"

"جگت نے مجھے کہیں دیکھ لیا تھا اور وہ میرے پیچھے پیچھے چلا آتا تھا ۔ ۔ ۔ "

"جگت کون ہے ؟"

"ہمارے گاؤں کا ایک لڑکا ــــ دو برس سے میرے پتا کی منت سماجت کر رہا تھا کہ ویراں کی شادی مجھ سے کر دو "۔

"تمہارے پتا کیوں نہیں مانتے تھے ــ ؟"

"وہی زمین کا جھنجھٹ تھا ــــ ساری زمین تو سیٹھ جی کے یہاں رہن پڑی ہوئی تھی ــــ"

ایک پتھریلا سکوت طاری ہو گیا ــــ پھر جیسے پتھر کے دل میں کوئی کیڑا رینگنے لگا اٹھا ۔

"جگت کیسا تھا شاہنی ۔۔؟"

"اس جیسا کون پیدا ہو سکتا ہے دیپ ـــــ اس کے قدموں تلے تو دھرتی بھی کانپتی تھی ۔"

"کیا اس نے تمہارے پتا کو روکا نہیں ـــ؟"

"جب ایک طرف چاندی کی جھنکار سنائی دے رہی ہو دیپ تو پھر کوئی آواز کان میں نہیں پڑتی ۔"

"کیا وہ خاموش رہا ۔ ؟"

"نہیں دیپ ـــ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اگر اجازت دو تو وہ مجھے ایسی جگہ لے جائے گا جہاں کوئی میری گرد کو نہ پہنچ سکے ۔"

"پھر کیا ہوا ۔ ؟"

"میں ہی ڈر گئی ـــ ادھر میرے پتا سیٹھ جی سے وعدہ کر چکے تھے ـــ میں سوچتی تھی اگر میں چلی گئی تو میرے بعد میرے پتا اور میرے بھائی کا کیا حال ہوگا ۔"

"میں نے تمہیں سچی کہانی سنائی ہے نا ۔ ؟"

"سچی کیسے ۔ ؟"

"میں نے کہا تھا کہ جب وہ لڑکی کنوئیں میں کودنے لگی تو پیچھے سے اسے ایک پری نے پکڑ لیا ۔"

"ہاں ـــ ۔"

"اس پری کا نام زندگی بھی ہے شاہنی ـــ ۔"

"کون سی زندگی دیپ ۔ ؟"

"یہی زندگی ـــــ اور کون سی ـــ"

"سب جھوٹی باتیں ہیں دیپ ـ؟"

"جگت اب کہاں ہے ـ؟"

"اپنے ہی گاؤں میں "

"کیا تم کبھی گاؤں نہیں گئیں ـ؟"

"نہیں دیپ ـــــ جس دن میرے پتا نے مجھے ڈولی میں بٹھا کر الوداع کیا تھا اسی دن میں نے یہ ٹھان لی تھی کہ میں اب لوٹ کر نہیں آؤں گی"

"کیوں ـ؟"

"جن والدین نے مجھے بیچ کر دام کھرے کر لیے ـــــ میں ان کی بھلا کیا ہوتی ہوں"

"انہوں نے کئی سندیسے بھیجے ـــــ سیٹھ جی سے بھی انہوں نے کہا ـــــ مگر میرا وہاں جانے کو جی نہ چاہا ـــــ اب بھی سیٹھ جی کے بینا جانے پر میرے سامنے وہ میری منتیں کرتے رہے لیکن میں نے ایک ہی "نہیں" پکڑ لی ـــــ اور پھر دیپ ـــــ" اس سے آگے شاہنی کچھ نہ کہہ سکی ـ

جگدیپ نے تھوڑی دیر کے بعد پوچھا ـــــ "تم کیا کہنے والی تھیں ـــــ؟"

"پہلے چلی جاتی تو چلی جاتی ـــــ لیکن اب تو میں ہرگز نہیں جاؤں گی ـــــ اب تو مجھے قسم ہے"

"کیوں ـ؟"

"مجھے جگت سے ڈر لگتا ہے"

"ابھی ابھی اس نے مجھے کسی کے ہاتھ سندیسہ بھجوایا تھا کہ ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے ـ

اگر میں رضامند ہوں تو . . . . "

"پھر تو پری والی کہانی بالکل سچی ہے ۔"

"سچی کہاں ہے دیپ ۔ ؟ یہ تو زخموں پر نمک چھڑکنا ہے ۔"

"تم جھوٹ کو سچ کیوں نہیں بنا لیتیں ۔ ؟"

شاہنی تڑپ کر اپنی چارپائی پر سے اٹھ کھڑی ہوئی ۔

"دیپ تو کیا کہہ رہا ہے ۔ ؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں ۔"

"کیا پاگل ہو گیا ہے ۔ ؟"

"نہیں ــــ میں سچ کہہ رہا ہوں شاہنی ۔"

بھگوان کو منظور نہیں تھا تو . . . . . "

"اسے اب منظور ہوگا ــــ تم جگت کو سندیسہ بھیج دو ۔"

"دیپ ــــ دیپ ــــ !" شاہنی کی آواز کپکپا رہی تھی ۔

"ایک بار تو ہمت کر کے دیکھو شاہنی ۔"

"نہیں ــــ دیپ نہیں ــــ میں مر چکی ہوں مرے ہوئے کو اور کیوں مارتے ہو ۔ ؟"

"اپنے دل کو مضبوط کیوں نہیں بناتی ہو شاہنی ۔"

"میں اپنا من مار چکی ہوں دیپ ــــ تو ایسی باتیں نہ کر ۔"

"ذرا سوچ کر بتاؤ شاہنی ــــ ایک طرف زندگی ہے اور ایک طرف موت ۔"

"مجھے موت ہی منظور ہے دیپ ــــ میں جس آگ کو بجھا چکی ہوں اسے دوبارہ روشن نہ کر ۔"

"کبھی کبھی پریوں کی کہانی بھی سچی ہو جاتی ہے، شاہنی"

ابھی تک شاہنی کی آنکھوں میں آنسو نہیں آئے تھے۔ لیکن اب وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

جگدیپ نے شاہنی کے پتا کو بلوا بھیجا اور اسے اس کے حوالے کر دیا۔ گاؤں والوں کو صرف اتنا پتہ چلا کہ چھوٹی شاہنی میکے جا رہی تھی ـــــ گہنوں کی صندوقچی جگدیپ نے اپنے ہاتھوں سے بھری اور چھوٹی سیٹھانی کو اس کے میکے تک چھوڑنے گیا۔

"اس گھر میں سب کچھ تمہارا ہے شاہنی ـــــ جب بھی تمہیں ضرورت ہو اور جتنی بھی ضرورت ہو ـــــ"

"مجھے شرمندہ نہ کرو دیپ ـــــ" شاہنی جگدیپ کے گلے سے لگ کر رونے لگی۔ اور پھر اس نے کہا ـــــ "مجھے شاہنی کیوں کہتے ہو ـــــ ویراں کہو ویراں ۔۔۔۔"

گاؤں سے لوٹتے ہوئے جگدیپ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے دل میں خلا پڑ گیا تھا ـــــ ایک سرور، ایک خمار میں وہ گھوڑی پر سوار رہا۔ اور نہ جانے کب واپس گاؤں لوٹ آیا۔ اس نے اپنی گھوڑی کا رخ چچی بیگماں کے گھر کی طرف موڑ دیا۔ گھوڑی سے اتر کر مکان کے پچھواڑے میں برگد کے پیڑ تلے جا کھڑا ہوا۔

برگد کی چھاؤں اسے آج جتنی کبھی حسین نہیں معلوم ہوئی تھی — برگد کے پتوں سے اس نے اپنی آنکھیں ڈھانپ لیں — اور پھر اس کے دل میں ایک کسک پیدا ہوئی — "چھاؤں — صرف چھاؤں — ایک بھی پھل نہیں۔ تو نے کہا تھا نوراں کہ بیری کا پیڑ لگائیں — سرخ سرخ میٹھے بیر کھائیں گے۔ آم کا پیڑ لگالیں لیکن میں نے ہی کہا تھا — "پھلوں کی کیا ضرورت ہے — میرے لیے چھاؤں ہی بہت ہے — نوراں — میری قسمت میں کوئی پھل نہیں تھا۔!"

جگدیپ نے فائن آرٹس کورس کے دونوں سال پورے کر لیے ــــ اسکول کے پرنسپل نے دیکھا کہ جگدیپ کے اندر کوئی چنگاری سلگ رہی ہے اس کی بنائی ہوئی تصویروں میں ایک معنویت ہوتی تھی اور اس کے رنگوں سے اس کے دل کی حرارت آشکار ہوتی تھی ۔ پرنسپل یہ نہیں چاہتا تھا کہ جگدیپ اس اسکول کو چھوڑ کر چلا جائے ۔

اس نے جگدیپ کو اس اسکول میں ملازمت کی پیش کش کی ۔ مگر اس کو نوکری کی خواہش نہیں تھی ــــ ایک عظیم فن اس کے اندر جیسے انگڑائیاں لے رہا تھا ۔ گاؤں کی زمین سے جگدیپ کو گزر بسر کے لیے اچھا پیسہ مل رہا تھا ــــ اس لیے اب اپنے ماموں کے مکان کی بالائی منزل پر اپنے لیے دو کمرے تعمیر کروالئے تھے ــــ ایک کمرے کو اپنا سٹوڈیو اور دوسرے کو اپنی خوابگاہ بنا لیا تھا ۔

"جس منزل کی آرزو آپ نے میرے دل میں پیدا کی ہے ۔ اب ذرا اس کی دشواریوں کا مجھے سامنا کرنے دیجئے اور اس طویل راستے پہ جہاں تک میں چل سکتا ہوں مجھے چلنے دیجئے ــــ مجھے ملازمت کے بندھنوں میں آپ کیوں جکڑتے ہیں ۔"

"جگدیپ نے اپنے پرنسپل کو منا لیا ــــ"

"میں ماڈل سے پینٹنگ کرنا چاہتا ہوں ــــ آپ میری رہنمائی کرتے رہیئے گا۔" ایک دن جگدیپ نے اپنے پرنسپل سے کہا۔

"ہمارے ملک میں اس کا رواج نہیں ــــ کوئی لڑکی ماڈل بننے کے لیے تیار نہیں ہوگی ــــ تم کیا کروگے ــــ یہ کیسے ہوگا ــــ؟ پرنسپل کو یقین تھا کہ جگدیپ جیسا شاگرد نہ پہلے اسے ملا تھا اور نہ آئندہ کبھی ملے گا ــــ وہ اس کے اندر کی چنگاری کو بجھنے نہیں دینا چاہتا تھا۔

لیکن سماجی ماحول اتنا اچھا نہیں تھا ــــ اس کو اپنے سامنے کئی دشواریاں نظر آرہی تھیں ــــ دوسرے دن پرنسپل نے جگدیپ کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تمہارا کردار فولاد کی طرح مضبوط ہونا چاہیئے دیپ ــــ جب ہی تمہارے اندر کا فن کار زندہ رہے گا۔"

چند روز بعد ایک شام کو پرنسپل نے آکر جگدیپ کے سٹوڈیو کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ جگدیپ نے دروازہ کھول دیا ــــ ایک سانولی اور خوش جمال لڑکی پرنسپل کے ساتھ تھی۔

یہ رمندر ہے ــــ میری بیٹی ــــ میرے دوست کی بیٹی ــــ ہم اسے رمی کہہ کر بلاتے ہیں۔"

جگدیپ کو اب اس سے آگے کوئی استفسار کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس کو اتنی توقع ہی نہیں تھی ــــ جگدیپ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے پاؤں تین پر نہ پڑ رہے ہوں۔

"میں جلدی میں ہوں ٹھیک ساڑھے چار بجے میرا لیکچر ہے ــــ سوا چار

ہو چکنے — پرنسپل نے جگدیپ کے کندھے پر ایک تھپکی دی اور الٹے پاؤں واپس چلا گیا۔

"رمندر بہن — میں تمہارا کیونکر شکریہ ادا کروں — ؟" جگدیپ نے ایک نفیس کرسی کی طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

رمندر بیٹھ گئی لیکن اس نے کسی جوش و خروش کا اظہار نہ کیا۔ جگدیپ کو ایسا معلوم ہوا جیسے رمندر کو اس کا اپنا اشتیاق کھینچ کر نہ لایا ہو — پتا کا یا پتا کے دوست کا کہا نہ ٹال سکی ہو اور آگئی ہو۔

اس کے باوجود جگدیپ کے اشتیاق میں کوئی فرق نہ آیا۔ اس نے رمندر کا دل بہلانے کے لیے بڑے چاؤ کے ساتھ کہا — "میں پرنسپل صاحب کی ہر ایک توقع پر پورا اتروں گا — میں بڑی محنت کروں گا — دن رات محنت کروں گا۔"

رمندر نے جیسے جگدیپ کی بات کو غور سے نہ سنا — جگدیپ کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اپنی بات کو ٹھیک طرح نہ کہہ پایا ہو — اس نے کچھ اور بھی کہنا چاہا مگر رمندر اس کی طرف دیکھ ہی نہیں رہی تھی۔

جگدیپ خاموش ہو گیا — اچانک اُس کے دل میں یہ یقین پیدا ہوا کہ وہ تھوڑے سے ہی دنوں میں رمندر کا اعتماد حاصل کر لے گا اور پھر وہ آج کی طرح بے دل نہیں رہے گی — آج جگدیپ نے اپنے پرنسپل کی اس ہدایت کا مطلب پا لیا۔ "تمہارا کردار فولاد کی طرح مضبوط ہونا چاہیئے دیپ — جب ہی تیرا اندر کا فن کار زندہ رہے گا۔"

"کیا میں آپ کو اپنی کچھ تصویریں دکھاؤں — ؟ اچھی تصویریں تو نہیں ہیں — ابھی میرے ہاتھ میں پختگی نہیں آئی — "

"میں نے آپ کی تقریباً تمام تصویریں دیکھی ہوئی ہیں ـــ" رمندر نے آہستہ سے کہا ـــ

"شاید پرنسپل صاحب ان تصویروں کو گھر لے جاتے رہے ہیں ـــ" جگدیپ یہ کہہ خاموش ہوگیا ـــ اسے اس بات پر حیرانی ہوئی کہ اتنا پُرتپاک دل رکھنے والا پرنسپل ایسی روکھی پھیکی لڑکی کو اپنی بیٹی کیونکر کہتا ہے۔

"کیا چائے منگواؤں ـــ آپ تھک گئی ہوں گی ـــ" جگدیپ نے کہا۔

"نہیں ـــ"

بات جگدیپ کی سمجھ میں نہ آئی ـــ رمندر کی "نہیں" ـــ کچھ ایسی تھی کہ اسے دوبارہ کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

آپ اب تھک گئی ہوں گی ـــ کیا آپ پھر کسی دن آسکیں گی ـ؟" جگدیپ نے تھوڑی دیر کے بعد کہا۔

"کل آؤں گی ـــ" رمندر بولی اور پھر جگدیپ سے کچھ کہے بغیر تصویر کی طرف ایک نگاہ ڈالتے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئی۔

"کیا میں آپ کو چھوڑ آؤں ـ؟" جگدیپ نے دوڑ کر پوچھا۔

"نہیں ـ میرا سائیکل نیچے پڑا ہے ـــ میں خود چلی جاؤں گی"

رمندر نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا اور سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگی۔

جگدیپ اپنے اسٹوڈیو میں لوٹ آیا ـــ یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی کہ رمندر کا وطیرہ اچھا تھا یا برا ـــ لیکن اسے اتنا ضرور محسوس ہوا کہ کمرے کی ہوا بوجھل ہو گئی تھی ـــ پھر اُس نے تصویر کی طرف نظر دوڑائی ـ تصویر ادھوری تھی ـــ بالکل نامکمل ـــ

لکیروں میں سے ایک اچھی تصویر ابھرتی ہوئی نظر آنے لگی تھی ـــــ وہ سوچنا چھوڑ کر تصویر کی لکیروں کو مزید سلجھانے میں مصروف ہو گیا۔

رمندر اگلے روز بھی آئی ـــ اس سے اگلے دن بھی اور پھر وہ روز آنے لگی ۔ جیسے وقت مقرر کرنے یا کوئی سوال پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی ـــ وہ عین وقت پر آتی اور واپس چلی جاتی ۔

ہر روز جگدیپ حسب معمول اسے چائے پینے کے لیے کہتا اور ہر روز وہ سخت گیر لہجہ میں انکار کر دیتی ـــ تصویر کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر بھی منہ سے کچھ نہ کہتی ـــــ اس کی بے رخی نے اسے جیسے جکڑ رکھا تھا۔

دسمبر میں دن کو بھی ہر ایک پل تخ بستہ ہوتا ہے ـــ رمندر جب آتی تھی تو اس نے شال اوڑھا رکھا ہوتا تھا مگر تصویر کے سامنے بیٹھتے ہوئے اسے اپنا شال اتارنا پڑتا تھا۔ اور اس سے انگ انگ میں سرایت کرتی ہوئی سردی اس کے چہرے پر ظاہر ہونے لگتی تھی۔ جگدیپ نے کمرے میں انگیٹھی کا انتظام کر لیا اور کمرہ کافی گرم ہو گیا رمندر آرام سے بیٹھ جاتی مگر ابھی تک اس نے جگدیپ کی فرمائش پر ایک پیالی چائے نہیں پی تھی۔ "پاپا جی کہہ رہے تھے کہ اگر آپ کھیتوں پر جا کر خاکہ بنانا چاہیں۔ تو میں آپ کے ساتھ جا سکتی ہوں ـــ ایک دن رمندر نے کہا۔

جگدیپ خوشی سے اچھل پڑا۔

رمندر کی بے رخی سے اگرچہ وہ مایوس ہو چکا تھا۔ لیکن آج جب اس نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی بے رخی کانٹوں کی طرح چبھنے لگی۔ ساتھ ہی ساتھ رمندر کا یہ فقرہ " پاپا جی نے کہا تھا اگر ـــ تو میں آپ کے ساتھ جا سکتی ہوں ـــ اس کے دل پر ایک

تازیانہ کی طرح پڑا۔ جانتے نہ جانے کا اس سے کوئی واسطہ نہیں تھا ـــ وہ تو جیسے اپنے پاپا جی کے حکم کی تعمیل کر رہی تھی۔

کیسے چلیں گے ـــ؟ سامان ایک تانگہ میں رکھ لیں گے ـــ" جگدیپ نے کہا۔

کیوں ـــ؟ سائیکلوں پر چلیں گے ـــ میں اپنے سائیکل پر آجاؤں گی۔ آپ اپنی چیزیں اپنے سائیکل پر رکھ لیجیے گا ـــ کل گیارہ بجے"! اور رمندر یہ حکم دے کر وہاں سے چلی گئی۔

جگدیپ نے کئی باتیں سوچیں ـــ دوپہر کی روٹی بنوا کر ساتھ لے چلے ـــ تھرموس میں چائے لے چلے ـــ لیکن رمندر کی نہیں ـــ" اس کے دل میں ایک پتھر کی طرح جم گئی تھی اور اس پتھر کو ہٹانے کی اس میں جرأت نہیں تھی۔

دوسرے دن گیارہ بجے تھے جب رمندر آئی ـــ جگدیپ نے اپنا سامان اپنے سائیکل کے آگے اور پیچھے باندھ لیا اور پھر بڑی جسارت سے کام لیتے ہوئے اس نے رمندر سے پوچھا ـــ" کیا کچھ کھانے کے لیے راستہ میں لیتے چلیں۔؟"

"کوئی ضرورت نہیں ـــ یہ کہہ کر رمندر نے اپنے سائیکل کے پیڈل پر پاؤں رکھ دیا۔

چھ سات میل تک سائیکل چلانے کے بعد جگدیپ اور رمندر شہر کے باہر نہر سے گذر کر کھیتوں میں پہنچ گئے ـــ جگدیپ نے ایک دل پسند جگہ کا انتخاب کیا اور سائیکل ایک طرف رکھ کر سامان کھولنے لگا۔

جگدیپ ایک یا ڈیڑھ بجے تک کام کرتا رہا۔ سرسوں کے کھیتوں کا سونا جگدیپ کے کاغذوں پر اترتا رہا اور پھر جگدیپ کی نگاہ ایک انتہائی سوکھے ہوئے پیڑ پر پڑی ـــ اچانک اسے ایک خیال سوجھا ـــ سوکھے ہوئے پیڑ کی شاخیں دور دور تک پھیلی ہوئی

تھیں لیکن ایک بھی پتہ کسی شاخ کے ہاتھ میں نہیں تھا —— اگر اس پیڑ کے تنے
کے ساتھ لگ کر رمندر کھڑی ہو —— میں تصویر بناؤں اور اس کے نیچے لکھ دوں ——
پت جھڑ اور بہار —— !"

وہ کاغذ پر سرسوں کے کھیتوں کا سونا ایک طرف رکھ کے "پت جھڑ اور بہار !"
کی تصویر بنانے لگا۔

دو بج گئے —— جگدیپ نے ہاتھ سے برش ایک طرف رکھتے ہوئے کہا ——
"دیوی جی —— آپ تو برت رکھ سکتی ہیں لیکن میں نہیں رکھ سکتا۔ آؤ واپس چلیں"
رمندر نے اپنے سائیکل سے بندھی ہوئی ٹوکری کھولی اور ایک طرف تولیہ بچھا
کر بندھے ہوئے پیکٹ کھول دیئے —— رمندر نقرموس میں نہ چائے لانا بھولی تھی
نہ پلیٹ اور پیالیاں —— کھانے والی چیزوں کے پیکٹ اتنے تھے کہ وہ دونوں مل کر انہیں
دن بھر ختم نہیں کر سکتے تھے۔

سب چیزیں نہایت اچھی تھیں۔ جگدیپ کھاتے چلا جا رہا تھا۔ ابھی پلیٹ
میں پہلی چیز ختم نہیں ہونے پاتی تھی کہ رمندر اس میں اور ڈال دیتی تھی اور جگدیپ
ضرورت سے زیادہ کھا رہا تھا لیکن اس کے دل پر جو بوجھ تھا اس سے اٹھایا نہیں جا
رہا تھا —— "میں رمندر کا اعتماد نہیں حاصل کر سکا۔ میرے اتنے دنوں کا برتاؤ ——
میری محنت . . . ."

جگدیپ نے اپنے دل کو ذرا اور ٹٹولا —— پچھلے دنوں جگدیپ کے دوستوں نے اس
پر کئی آوازے کسے تھے —— "آج کل تم بھلا کسی سے کیوں ملنے لگے —— ایسا ماڈل ہاتھ تو
دوست نظروں پر کہاں چڑھتے ہیں ——" جگدیپ کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا اور

اس نے گرج کر دوستوں سے کہا تھا — "رمندر تو مجھے اپنی بہن سے بھی زیادہ . . . !"

کھانا ختم ہوا — رمندر نے جگدیپ کو چائے کی پیالی دی — اس کے بعد مزید دو گھنٹے کام کر کے دونوں اپنے سائیکلوں پر واپس چلے آئے۔

سردیوں میں بھرپور محنت کرنے کے بعد جگدیپ نے کئی تصویریں بنائیں لیکن تین تصویریں اس نے بڑی جانفشانی سے تیار کی تھیں — ایک تصویر کا عنوان تھا۔ "دنیا" اس تصویر میں جو لڑکی تھی وہ اس نے رمندر کے ماڈل سے تیار کی تھی — دنیا اسے خوبصورت معلوم ہوئی تھی — دنیا کا رنگ اس نے اپنے تصور سے بھرا تھا — دوسری تصویر — "پت جھڑ اور بہار" تھی — یہ تصویر اس نے سوکھے پیڑ اور رمندر کے بُت کو جوڑ کر تیار کی تھی — تیسری تصویر کتنے برس ہوئے نوراں کے سر پر ستاروں والا دوپٹہ پہنا کر اس نے جو خاکہ بنایا تھا اس سے تیار کی تھی — اس تصویر کا نام "سپنا" رکھا تھا — ستاروں والے دوپٹہ کے ارد گرد اس نے بادلوں کی طرح سپنے لپیٹ دیئے تھے اور نوراں کی آنکھیں اِس طرح تھیں جیسے وہ سپنوں کے بوجھ سے جھک گئی ہوں۔

مارچ کا مہینہ آ پہنچا ـــــ شہر کی ایک نہایت اچھی عمارت میں ہندوستان کے مشہور مصوروں کی تصویروں کی نمائش منعقد ہونے والی تھی ـــ پرنسپل کی فرمائش تھی کہ اس نمائش میں جگدیپ کی ایک پینٹنگ رکھی جائے ـــــ جگدیپ ابھی اپنے فن کو اس قابل نہیں سمجھتا تھا۔

بہت سی باتوں میں پرنسپل کی رائے اسے زیادہ وزنی نہیں معلوم ہوتی تھی ـــــ اس نے انکار کر دیا ـــــ پرنسپل نے اس کی تصویر کے لیے جگہ محفوظ کرالی تھی اور وہ اپنی ضد پر قائم تھا۔ اس نے جگدیپ کے اسٹوڈیو میں آکر تینوں تصویریں دیکھیں۔ ہر ایک تصویر کی بار بار جانچ کی اور آخر کار اس نے "سپنا" عنوان کی تصویر کو نمائش میں بھیجنے کے لیے منتخب کر لیا۔

"کتنی قیمت کی چٹ لگائی جائے ـــ" پرنسپل نے پوچھا ـــ اس کے پاس رمندر بھی کھڑی تھی اور جگدیپ بھی ـــــ دونوں میں سے کوئی نہ بولا۔ پرنسپل نے خود ہی کہا ـــــ "دو سو سے کم نہیں ہونی چاہیئے ـــ"

"میں یہ تصویر بیچنا نہیں چاہتا ـــ!" جگدیپ نے آہستہ سے کہا۔

"خریدتا کون ہے ـــ یونہی ایک رواج ہے ـــ قیمت کی چٹ ضرور لگانی چاہیئے۔"

"نہیں ــــ یہ چٹ لگا دو ــــ تصویر بیچنے کے لیے نہیں ہے ــــ"
ایسا کرنا غرور کے مترادف ہوگا ــــ اچھا ایسا کرو ــــ دو سو کی جگہ تین سو لکھ دو تاکہ اگر کوئی خریدنا بھی چاہے تو نہ خریدے ۔ ساڑھے تین سو لکھ دو ۔

جگدیپ خاموش ہوگیا ــــ رمندر نے بھی کچھ نہ کہا ۔ پرنسپل نے وہ تصویر نمائش میں بھیج دی

نمائش منعقد ہوئی ۔ شائقین اور فن کاروں کا ایک جمگھٹا لگ گیا ۔ شہر میں نمائش کی باتیں ہوتیں ــــ ان باتوں میں عقل و دانش کو دخل نہیں تھا صرف رسماً ایسی باتیں کی جاتی تھیں ــــ یہ ٹھیک تھا کہ لوگ اپنے آپ کو فن کار کا پرستار ظاہر کرنے کے لیے باتیں چھیڑ دیتے تھے مگر یہ بھی درست تھا کہ جہاں دو چار جمع ہوئے اِن تصویروں کی باتیں کرنے لگے ۔

پھر پتہ چلا کہ جگدیپ کی تصویر فروخت ہوگئی ہے ــــ نمائش کے منتظمین نے اسے مبارک باد دی ــــ لوگ اب اور بھی زیادہ اشتیاق کے ساتھ اس تصویر کو دیکھ رہے تھے لیکن جگدیپ کا چہرہ کچھ اس طرح ہوگیا جیسے کسی نے اِس کو دھکا دے کر اس کے ہاتھ سے اس کی چیز چھین لی ہو ۔

نمائش ختم ہوگئی ــــ جگدیپ چپ چاپ اپنے سٹوڈیو میں بیٹھا رہتا ان دنوں اپنے برشوں اور رنگوں کی طرف دیکھنے کو اس کی طبیعت نہیں چاہتی تھی ۔ رمندر بھی کئی دنوں سے نہیں آئی تھی ــــ جگدیپ کے سٹوڈیو پر جیسے ویرانی اور سونا پن مسلط ہوتا جا رہا تھا ۔

ایک دن جگدیپ اپنی اداسی کو برداشت نہ کر سکا اور وہ پرنسپل سے ملنے کیلئے

اس کے گھر چلا ــــ پرنسپل گھر پر موجود نہیں تھے ــــ اس نے رمندر کے گھر کا پتہ پوچھا اور ادھر چلا گیا۔

شام کا ہلکا دھندلکا اس کے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا ــــ نوکر نے اسے رمندر کا کمرہ دکھایا اور کمرے کے دروازہ کو اس نے آہستہ سے ٹھوکر لگائی ــــ سامنے رمندر کھڑی تھی۔

"آپ ــــ" رمندر جیسے کانپ گئی۔

جگدیپ اب رمندر کی بے رُخی سے بالکل مانوس ہو چکا تھا ــــ اس کی بے اعتنائی کو اب وہ اس کی فطرتِ ثانی تسلیم کر چکا تھا ــــ آج جگدیپ حیران تھا رمندر کی گھبراہٹ نے اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ پیدا کر دی تھی۔

جگدیپ کمرے میں دو قدم آگے بڑھ چکا تھا لیکن وہ وہیں کا وہیں رُک گیا ــــ اور رمندر نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے کرسی کا سہارا لیا۔

"رمی کیا میں چلا جاؤں ــ؟" جگدیپ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس سے کوئی بھاری گناہ سرزد ہو گیا تھا۔

رمندر کا رنگ نچڑے ہوئے لیموں کی طرح زرد تھا ــــ اس سے کچھ کہا نہ گیا ــــ جگدیپ نے گھبرا کے کمرے میں دیکھا ــــ سامنے بڑی الماری کے دونوں پٹ کھلے تھے ــــ الماری میں اس کی تصویر "سپنا" پڑی ہوئی تھی۔

"رمی ــــ جگدیپ کے منہ سے نکلا اور وہ گھبرا کر الماری کی طرف لپکا ــــ

جگدیپ نے ایک بار تصویر پر نظر دوڑائی اور پھر رمندر کی طرف دیکھا ــــ رمندر اپنی ہتھیلیوں سے منہ کو چھپا کر سسکیاں لے رہی تھی۔

"ری — !" جگدیپ کی رگ رگ میں جیسے کسی نے گرم گرم سیسہ بھر دیا تھا ۔

"ہاں — میں نے ہی خریدی ہے — " رمندر شاید اپنے آنسوؤں کی کمزوری پر جھلا اٹھی تھی اسے پھر اپنے آپ پر غصّہ آ گیا تھا ۔

رمندر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا مگر اس نے آہستہ سے کہا — تمہیں یہ تصویر خریدنے کی کیا ضرورت تھی — تم مجھ سے کہتیں — میں اسے تمہارے کمرے میں آکر لٹکا دیتا ۔"

رمندر کے انگ انگ میں جیسے زہر جوش مار اٹھا اور وہ کرسی سے اُٹھ کر دوڑتی ہوئی الماری کی طرف گئی — تصویر رمندر کے ہاتھوں میں تھی اور پھر وہ پورا زور لگا کر تصویر کے پرزے اڑانے لگی ۔

جگدیپ پتھر کی طرح جم گیا تھا — رمندر کہہ رہی تھی — نوراں — نوراں — نوراں — میں اس کی تصویر کو برداشت نہیں کر سکتی — نہیں کر سکتی ۔ میں نے اس کو اسی لیے خریدا تھا کہ پھاڑ کر پھینک دو — !"

کاغذ کے ٹکڑے فرش پر چاروں طرف پھیل گئے — کاغذ کے کتنے ہی ٹکڑے جگدیپ کے قدموں کے قریب پڑے ہوئے تھے — رمندر نے شاید کچھ اور بھی کہا لیکن جگدیپ کو اب کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا — ایک ہی لفظ جگدیپ کے کانوں میں گونج رہا تھا — نوراں — نوراں — نوراں — "

پتہ نہیں کب وہ اس کمرے سے اُٹھ کر چلا آیا — رمندر کاغذ کے ان ٹکڑوں کے پاس فرش پر بیٹھی سسک رہی تھی —

شہر کی فضا میں اب جگدیپ سے سانس نہیں لیا جاتا تھا ــــ کسی روز وہ گھنٹوں نہر کے کنارے بیٹھا رہتا اور کسی روز شہر سے دور کھیتوں کی مینڈھ پر ــــ اسے یوں محسوس ہوتا شہر کی فضا میں جیسے تلخی گھلی ہوئی تھی ــــ تشنگی سے اس کا حلق سوکھتا جا رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر کڑوی اور کسیلی پپڑیاں جمتی جا رہی تھیں۔ سٹوڈیو میں بیٹھا ہوتا تو جگدیپ کو یوں لگتا جیسے تمام رنگ آپس میں گڈمڈ ہو گئے ہوں گے ــــ ایک میلی اور کالی دھار بن کر اس کی آنکھوں پر برس رہے ہوں ــــ

کئی برس ہوئے جگدیپ نے ایک خواب دیکھا تھا ــــ کوئی نوراں کے سر پر اوڑھی ہوئی ستاروں والی چنری کے ستارے ادھیڑ رہا تھا ــــ آج کئی برسوں کے بعد وہ خواب اور بھی بھیانک ہو گیا تھا ــــ کوئی نوراں کے چہرے کو ناخنوں سے نوچ رہا تھا ــــ

اگلے ہفتہ جگدیپ لاہور چھوڑ کر چلا گیا ــــ ایک بار تو اس کا جی چاہا کہ وہ اپنے گاؤں جائے لیکن جب اسے گاؤں کا خیال آیا تو کسی نے جیسے اس کو پکارا نہیں۔ جیسے کسی نے اس کا خیر مقدم نہ کیا ــــ اس کا فن ہی اسے انگلی کے اشارے سے اپنے پاس بلا

رہا تھا وہ اس کے قریب جاتا تو اس کا فن اس سے اور بھی دور نکل جاتا اور پھر اسے اشاروں سے اپنے پاس بلانے لگتا ـــــ وہ اور آگے بڑھتا ـــــ اس کا فن اس سے بھی آگے نکل جاتا ـــــ جگدیپ اس کے پیچھے پیچھے مزید آگے بڑھتا گیا۔

دِلی آکر جگدیپ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے فن نے دھرتی پر اس کے لیے کوئی مقام پیدا کر دیا ہو ـــــ تین کمروں کا ایک فلیٹ کرایہ پہ لے کر جگدیپ نے وہاں اپنا سٹوڈیو بنایا ـــــ اب اس کی لکیروں میں ایک لچک پیدا ہوتی جا رہی تھی ـــــ رنگوں میں پیارے پیارے سپنے گھلتے جا رہے تھے ـــــ اس نے اپنے دن اور اپنی راتیں اپنے فن کے حوالے کر دیں ـــــ یہاں کئی فن کاروں سے اس کا واسطہ پڑا۔ کبھی اسے قدیم فنِ مصوری اپنی طرف کھینچتا اور کبھی وہ جدید آرٹ کی تکنیک پر غور کرنے لگتا۔ بحث ہوتی۔ غیر ممالک کے فن مصوری کی نمائش لگتی ـــــ اس کی واقفیت کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔

اور پھر ایک حادثہ اس کی زندگی پر ہتھوڑے کی ضرب کی طرح ٹوٹا۔ ایک دن اس کے ایک دوست مصوّر نے اس سے کہا کہ اس کی واقف دو لڑکیاں ایک دو روز کے لیے اس شہر میں آ رہی ہیں۔ ان کی رہائش کا کوئی انتظام نہیں ہے اگر وہ ایک دو روز کے لیے اپنے فلیٹ کا ایک کمرہ دیدے تو وہ اس کا بیحد ممنون ہوگا۔

دوسرے دن رات کو دس بجے اس کا دوست اس کے پاس آیا ـــــ اس کے ساتھ دو لڑکیاں تھیں ـــــ انہوں نے کمرہ کھولا اور وہ اس میں چلے گئے۔

جگدیپ نے اپنے نوکر سے ان کے لیے کھانا تیار کروالیا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے گیارہ بج گئے ـــــ دونوں لڑکیاں اور اس کا دوست کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔

کوئی آدھ گھنٹہ چاروں مل کر تاش کھیلتے رہے اور پھر جگدیپ سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا آیا۔

نہ جانے رات کے کتنے بجے تھے جب کسی نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا جگدیپ نے دروازہ کھول دیا — ان دو لڑکیوں میں سے ایک لڑکی اسکے کمرے میں آگئی —

جگدیپ ابھی تک اس سے کوئی سوال نہیں کر سکا تھا — لیکن اس لڑکی نے دروازہ اندر سے بند کر دیا اور بجلی بجھا دی۔

جگدیپ کی آواز جیسے اس کے حلق میں اٹک گئی — ایک پتلا اور نازک بدن اس کے بدن سے چمٹ گیا۔ پتلی پتلی باہیں اس کے گلے میں پڑی ہوئی تھیں اور کسی کا سانس اس کے سانسوں کو چھو رہا تھا۔

جگدیپ کو یوں لگا جیسے اس کے ہوش اڑتے جا رہے ہوں۔ پانی کی ایک لہر نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا تھا اور وہ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا کے پانی میں نہ جانے کس طرف بہتا چلا جا رہا تھا — کنارا کہاں رہ گیا تھا اور کتنی دور تھا — اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا — کسی نے جگدیپ کے ہونٹ اپنے ہونٹوں میں لیے ہوئے تھے۔

ایک اور لہر آئی — اس کے جسم کو ایک دھکا سا لگا — وہ اپنے پلنگ پر گر پڑا — اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے دریا میں سے نکال کر سمندر میں پھینک دیا تھا۔

اس کے ذہن میں جیسے بادل گرج رہے تھے — وہ اکیلا تھا — بالکل تنہا — بادل گرج رہے تھے — ایک طوفان اٹھا ہوا تھا — اس نے گھبرا کر کسی کو پکارنا چاہا۔

مگر اس نے دیکھا کہ بادلوں کی گھن گرج میں اسے اپنی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ پھر بادلوں کی گرج میں بجلی چمک اٹھی ـــ اس نے بجلی کی روشنی میں دیکھا کہ وہ کہاں تھا۔ وہی پلنگ تھا اور چھریرے بدن کی ایک نازک سی لڑکی اس کی قمیض کے بٹن کھول رہی تھی ـــ اس نے تڑپ کر کہا:

"تم کون ہو ـــ؟"

"کون بھی ہوں ـــ آج کی رات میں تمہاری ہوں"

"نہیں ـــ نہیں ـــ تم میری نہیں ہو ـــ چلی جاؤ"

"کہاں جاؤں بابو ـــ؟"

"میں نہیں جانتا تم چلی جاؤ"

"یہ کیا مذاق ہے بابو؟"

"میں کوئی مذاق نہیں کر رہا ہوں ـــ چلی جاؤ"

"مجھے بلوایا کیوں تھا ـــ؟"

"تمہیں کس نے بلوایا ہے ـــ؟"

"تمہارے دوست نے ـــ"

"کون سا دوست ـــ؟"

"تمہارے دوست شنکر نے"

"شنکر کہاں ہے ـــ؟"

"ساتھ کے کمرے میں"

"تم اس کے پاس چلی جاؤ"

"اس کے پاس تو دوسری لڑکی ہے۔"

"میں کچھ نہیں جانتا ــــ کچھ نہیں جانتا۔"

"کیا میں اپنی آج کی رات تباہ کردوں۔ میرے پیسے کون دیگا؟"

"کیسے پیسے۔؟"

"شنکر نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے پچاس روپے ملیں گے۔"

"پچاس روپے۔ کیسے پچاس روپے۔؟"

"آج کی رات کے پچاس روپے۔"

"میں تمہیں پچاس روپے دیدوں گا۔ لیکن تم یہاں سے چلی جاؤ۔"

لڑکی نے غصہ سے اپنے دونوں ہاتھوں کو زور سے مروڑا اور اس کے ہاتھوں میں کوئی بھکارن ہوں ــــ ؟ لڑکی نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا جگدیپ اب اس کی سسکیوں کی آواز سن رہا تھا۔

بجلی چمک کر غائب ہو چکی تھی۔ لیکن غائب ہونے کے بعد تاریکی میں اور بھی اضافہ کر گئی تھی ــــ اس اندھیرے میں جگدیپ کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے پہلو کے ساتھ چمٹا ہوا سسک رہا تھا۔ جگدیپ نے سسکتی ہوئی اس لڑکی کو زور سے بھینچ لیا اور پھر خود کو اس کی آغوش کے حوالے کر دیا۔

جگدیپ کی آنکھ کھلی تو شنکر اس کی پیشانی پہ ہاتھ رکھے ہنس رہا تھا۔

"صاحب۔ چائے پی لیجئے ــــ آج میں آپ کا بیرا بنا ہوا ہوں۔"

"تم ہو شنکر۔؟"

"میں جانتا تھا صاحب کی یہی حالت ہوگی ـــ اسی لیے میں نے نوکر کو چائے لیکر آنے نہیں دیا۔"

"شنکر۔"

"دیکھا تمہیں کیسا چونکا دیا"!

"چپ رہو شنکر۔"

"اتنا کیوں بنتے ہو یار ـــ کتنی پُر لطف رات کٹوائی ہے۔"

جگدیپ سے اب کچھ نہ کہا گیا ـــ شنکر نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کہا۔" پہلے تو تم نے اس لڑکی کو ڈرا ہی دیا تھا۔"

جگدیپ نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا ـــ اس نے چپکے سے چادر ایک طرف ہٹا دی ـــ پھٹی ہوئی قمیص گلے سے اتار کر نئی قمیص پہن لی۔

میز پر چائے پڑی ہوئی تھی ـــ جگدیپ اسے ایک ہی سانس میں پی گیا۔ اور الماری میں سے سو روپیہ کا نوٹ نکال کر جگدیپ نے شنکر کے ہاتھ میں تھما دیا۔" شنکر اس وقت تم چلے جاؤ ـــ فوراً چلے جاؤ ـــ"

جگدیپ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلا ـــ تھوڑی سی دیر کے بعد ایک ٹیکسی کے رکنے کی آواز سنائی دی اور پھر ساتھ کے کمرے میں سب کے چلے جانے کا شور سنائی دیا۔ ایک لمبا سانس لے کر جگدیپ اٹھا اور اپنی الماری کے بڑے آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا ـــ دیکھتا رہا ـــ دیکھتا رہا ـــ اور پھر جیسے آئینہ میں نظر آنے ہوتے چہرے کو وہ پہچان نہ سکا ـــ وہ پھر ایک گہرا سانس لیکر آئینہ کے سامنے سے ہٹ گیا۔

جب سے رندلا نے نوراں کی تصویر کے ٹکڑے کیے تھے تب سے جگدیپ نے کئی تصویریں بنائی تھیں۔ لیکن ستاروں جڑی پوشاک والی نوراں بنانے کی اسے ہمت نہیں ہوئی تھی۔

تازہ حادثہ کے بعد جگدیپ کو اپنا آپ ایک اُگلا ہوا نوالہ محسوس ہونے لگا۔ ایک ہی خیال تھا اور ایک ہی چہرہ تھا جس کے متعلق سوچتے ہوئے جگدیپ کو اپنا آپ پاکیزہ معلوم ہوتا تھا ـــــ اس تصویر کو دوبارہ بنانے کا جنون اس کے سر پر سوار ہو گیا۔

کئی برس ہوئے جب وہ آرٹ اسکول میں پڑھتا تھا اس نے گاؤں میں اپنے مکان کے چوبارہ میں اپنے ادھورے اور ناپختہ فن کے ساتھ نوراں کا جو خاکہ بنایا تھا اسے ڈھونڈ کر نکالا اور اس کی بنیاد پر اپنے تصور میں رنگ بھرنے لگا۔

تصویر بنتی چلی گئی ـــــ اس تصویر سے بھی کہیں زیادہ حسین تصویر جسے رندلا نے پھاڑ دیا تھا ـــ جوں جوں تصویر مکمل ہوتی گئی توں توں جگدیپ کو اطمینان قلب نصیب ہوتا ہوا محسوس ہوا ـــ اور جب تصویر کو فریم کروانے کے بعد جگدیپ نے اسے اپنے سٹوڈیو میں لٹکایا تو اس دن اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے ماتھے پر ہتھوڑے کی چوٹ کا نشان مٹ گیا ہو۔

۱۹۴۷ء کے آخر میں جگدیپ کا دل دلّی سے اُوب گیا۔

اجنتا ایلورا کے غاروں اور جنوبی ہند کے مندروں کی مورتیوں نے اسے پکارا۔

اپنے فلیٹ کے دو کمروں کو بند کر کے اس نے تیسرا کمرہ اپنے ایک دوست پریم کو رہنے کے لیے دیدیا اور آپ اپنے فن کے بلاوے پر نکل کھڑا ہوا۔

۱۹۴۷ء کا سال گزر گیا اور اب ۱۹۴۸ء بھی بیت رہا تھا۔ جب وہ دلی واپس آیا۔ اخباروں میں اس نے بہت کچھ پڑھا تھا۔۔ گاؤں سے جب بھی روپے آتے تھے تو چچا کی خیر و عافیت بھی معلوم ہوتی تھی۔ پنجاب کے متعلق بہت کچھ لکھا ہوتا تھا لیکن جو کچھ اس نے دلی آکر دیکھا تھا وہ اس کی سوچ سے باہر تھا۔ مگر لوگ کہہ رہے تھے کہ زندگی اپنے اصل مقام آگئی ہے۔

وہ بار بار لوگوں کے مرجھائے ہوئے چہروں کی طرف دیکھتا۔۔۔ لکھ پتی کنگال ہو گئے تھے اور جو لوگ اپنے کنبوں کے افراد سے ہاتھ دھو کر آئے تھے اُن کے چہرے اس طرح تھے۔ جیسے ان کے انگ کٹ گئے ہیں اور اب وہ اپاہج بن کر اس دھرتی پر رینگ رہے ہوں۔۔ جگدیپ کو کبھی ۱۹۴۷ء کی تباہی عظیم نظر آتی اور کبھی اس تباہی سے خریدی ہوئی دیش کی آزادی پیاری معلوم ہوتی۔

جگدیپ نے اپنے سٹوڈیو کو دوبارہ سنوارا اور سجایا۔ گذشتہ برسوں میں فن پختگی سے اس کے ہاتھ مالا مال ہو گئے تھے۔ لیکن ابھی اس کا کام میں جی نہیں لگتا تھا۔۔۔ اس نے چچا کو خط لکھا کہ وہ چند روز کے لیے گاؤں آ رہا ہے۔

چچی نے جگدیپ کی پیشانی چومتے ہوئے بڑے چاؤ سے کہا۔۔۔ "میں قربان جاؤں۔۔۔"

جگدیپ کو ایک بار تو یوں محسوس ہوا جیسے وہ چودہ برس کے بن باس کے بعد اجودھیا واپس آیا ہو۔

"سناؤ چچی ــــ تمہارا کیا حال رہا؟" جگدیپ نے بار بار پوچھا۔

"شاید تیرا منہ دیکھنے کے لیے ہی زندہ رہ گئی ہوں ــــ ورنہ پنجاب کا جو حال ہُوا ــــ توبہ ہی بھلی"

"کیا ہمارے گاؤں میں بھی کچھ ہُوا ۔؟"

"تم عمر بھر نادان ہی رہو گے ــــ ہمارے گاؤں میں دیوتا تو نہیں رہتے تھے"

"یہاں تو کیا ہندو کیا مسلمان سب بھائیوں کی طرح رہتے تھے"

"سب جگہ بھائیوں کی طرح رہا کرتے تھے۔ مگر سب کے سروں پر بھوت سوار ہو گیا"

"کوئی بری بات تو نہیں ہُوئی ــ؟"

"کیا تو نے گاؤں میں اپنی جان پہچان کا کوئی آدمی بھی دیکھا ہے؟ نہ جانے کہاں کہاں سے لوگ آگئے ہیں ــــ یہاں کے لوگ اُجڑ کر اُدھر جا بیٹھے ہیں اور اُدھر کے لوگ یہاں آگئے ہیں"

اچانک جیسے کوئی اپنے قدموں میں سانپ دیکھ لے بالکل اسی طرح جگدیپ کو ایک خیال آیا اور اُس نے ڈرتے ہُوئے چچی کے منہ کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے دیپ ــــ"

"چچی بیگماں ــــ؟"

"بیگماں بیچاری نہ جانے کہاں دھکے کھا رہی ہوگی ــــ یہاں سے تو بال بچوں سمیت خیر و عافیت سے چلی گئی تھی ــــ تیرے چچا اور دو آدمی اسے ساتھ کے گاؤں میں پہنچا آئے تھے ــــ اس سے آگے اگر تقدیر اچھی رہی ہوگی تو کسی نہ کسی ٹھکانے پہ پہنچ گئی ہوگی ــــ بھگوان کی باتیں بھگوان ہی جانے"

"بال بچے ۔؟"

"نوراں اور اس کا خاوند بھی مر اتھے ــــ نوراں کے دو بچے تھے ــــ"

"اچھا تو وہ یہاں سے جا چکے ہیں ۔"

"پاگل نہ ہو تو ــــ یہاں رہ کر انہیں کیا اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا تھا ؟ ایک دن تو وہ بمشکل بچے تھے ــ کسی نے ان کے گھر میں آگ لگا دی تھی ۔"

"آگ ــ؟

"جا کر ذرا دیکھ تو سہی ــ مکان کھلا پڑا ہے ــــ ہاں سچ ــ"

"کیا ہے چچی ــــ"

"گھر کے پیچھے برگد کا جو پیڑ تھا وہ تو نے اور نوراں نے لگایا تھا ۔"

جگدیپ سے بولا نہ گیا ۔

"پچھلی دیوار جب گری تو برگد کا وہ پیڑ بھی گر لیا ــ"

جگدیپ کو یوں محسوس جیسے اس کا رُواں رُواں کانپ رہا ہو ۔

"جاتے ہوئے نوراں میرے گلے سے لگ کر نہ پوچھو کتنا روئی ــــ کہتے لگی گھر کے جلنے کا غم نہیں ــــ اب مجھے کون سا یہاں لوٹ کر آنا ہے ۔ لیکن کاش برگد کا پیڑ نہ گرتا ــــ وہ دیپ کی نشانی تھا ــــ"

اب جگدیپ کے دل میں رُکا ہوا طوفان بہہ نکلا ــــ ازل سے نادان بچے کی طرح وہ چچی کی گود میں سر رکھ کر رونے لگا ــــ جگدیپ کو یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی عمر میں کبھی رویا بھی تھا ــ آج اسے یوں محسوس ہوا ۔ جیسے اس نے یہ طوفان اپنے دل میں برسوں سے رُکا ہوا تھا ۔

"یہ قیامت کسی ایک پر نہیں بیتی ہے دیپ ـــ سب پر گزری ہے"۔
چچی بار بار دیپ کی پیٹھ پر پیار سے ہاتھ پھیرتی اور کہتی ـــ "جو لوگ اُدھر سے آئے ہیں اور جو کہانیاں وہ سناتے ہیں سن کر پیروں تلے سے زمین نکل جاتی ہے ـــ تیرے ماموں کی پہلے ہی جالندھر تبدیلی ہو گئی تھی۔ نہیں تو نہ جانے اس کا بھی کیا حال ہوتا۔ سنا ہے لاہور میں کچھ کم نہیں ہُوا۔

شام کو جگدیپ نے ہاتھ مُنہ دھویا ـــ چچی نے اسے کچھ کھلایا پلایا۔ جگدیپ کو ایسا محسوس ہُوا جیسے اس کے اندر کوئی چیز دم توڑ چکی تھی ـــ کھانے کی بھوک اور زندہ رہنے کی بھوک ختم ہو چکی تھی۔

جگدیپ کے قدم رُک نہ سکے ـــ ایک موڑ سے گزر کر اس نے دوسرا موڑ پار کیا۔ اس نے بیگماں کے منہدم مکان کو پہچان لیا۔ اس منہدم مکان پہ بھی چھپر ڈال کر کچھ لوگ وہاں رہ رہے تھے۔ وہ دروازے کے آگے سے گزر گیا اور پچھواڑے پہنچا ـــ پاگلوں کی طرح اس کا جائزہ لیتا رہا۔ جیسے کوئی کھوئی ہوئی سوئی ڈھونڈ رہا ہو۔

ماں کے ہاتھوں کی چھاؤں کی کسی کو ضرورت نہیں تو راں ـــ یہ مسلمانوں کو ـــ نہ ہندوؤں کو ـــ اس کے دل میں بیٹھا ہُوا جیسے کوئی کہہ رہا تھا ـــ

سارے کشمیر میں گھوم پھر کر جگدیپ جب اچھابل پہنچا تو اس کے دل کو کچھ سکون نصیب ہُوا ـــ بہت سے لوگوں کو شاید یہاں زیادہ رونق نظر نہیں آتی تھی لہٰذا وہ آتے تھے اور چلے جاتے تھے لیکن جگدیپ کو یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے یہ مقام اسے اپنے قریب آنے کی دعوت دے رہا تھا۔ بہت سے کمروں پر مشتمل ایک بلڈنگ تھی۔ تھوڑے سے کرائے پر اسے ایک کمرہ مل گیا تھا ـــ کمرے کے سارے پردے گرا کر وہ کھڑکی کھول لیتا اور گھنٹوں وہاں کھڑا رہتا۔ کبھی اس کے جی میں آتا کہ وہ قدرت کی بھری ہوئی گود میں گم ہو جائے ـــ اس کی وسعت میں کھو جائے۔ اس کی ہریالی سے ڈھانپ دیا جائے ـــ کبھی اس سے اس قدر حسن و جمال برداشت نہ ہوتا ـــ وہ پھولوں اور پتیوں کو چھو نہ سکتا۔ حسن کی وسعت سے جیسے ڈر جاتا اور کھڑکی میں بیٹھ کر اسے دور سے دیکھتا رہتا۔

ایک دن باغ کی جھیل کے کنارے بیٹھا ہُوا جگدیپ کاغذوں اور رنگوں میں ڈوبا ہُوا تھا ـــ اسے جھیل کے پانی میں ایک پرچھائیں لہرتی ہوئی نظر آئی ـــ ایک نہایت ہی حسین و جمیل بُت تھا۔ جگدیپ کا جی چاہا وہ پیچھے مڑ کر دیکھے کہ وہ پرچھائیں کس کی تھی ـــ اس کے بعد اُسے یوں محسوس ہُوا کہ اُس نے اگر مڑ کر دیکھا تو پرچھائیں

والی لڑکی وہاں سے چلی جائے گی اور پھر پانی میں اس کی پرچھائیں نہیں پڑے گی ــــ اس کے سامنے پھیلی ہوئی جھیل ویران ہو جائے گی ــــ وہ اپنے کاغذوں پر جھکا رہا اور جھیل کے پانی اور جھیل میں لرزتی ہوئی پرچھائیں کو اپنے کاغذ پر اتارتا رہا۔

ہلکے ہلکے رنگ اس کے کاغذ پر پھیلتے جا رہے تھے ــــ جھیل کے پانی اور اس تیرتی ہوئی پرچھائیں کو جب اس نے کاغذ پر محفوظ کر لیا تو اسے اِس پرچھائیں کے گم ہو جانے کا خطرہ نہ رہا لہٰذا اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا ــــ پھولوں سے لدے ہوئے درخت کے پاس ایک لڑکی کھڑی تھی۔

کسی تصویر کے رنگوں میں جیسے جان پڑ جائے ــ وہ لڑکی اس کے تصوّر کی طرح حسین تھی۔ اس کی نگاہیں دور پیڑوں کے جھنڈ میں کھوئی ہوئی تھیں۔ پہلگام کے خیموں میں رہتے ہوئے اس نے بہت سے لوگ دیکھے تھے ــ برتنوں کی کھنک اور پارٹیوں کی چہل پہل میں اس نے مسرور عورتیں دیکھی تھیں ــ گھوڑوں پر لمبی سیر پر نکلی ہوئی خوش اور دلکش لڑکیاں دیکھی تھیں ــ گل بوٹوں کے جھرمٹ میں ناش کھیلتی ہوئی اور ہنستی ہوئی دوشیزائیں رنگ برنگے کپڑے پہنے ہوئے گروہ بنا کر چلتی ہوئی عورتیں اور کشمیر کی سیر کو آئے ہوئے پریوار اس نے دیکھے تھے۔ مگر ان میں سے کوئی بات نظر نہیں آئی تھی۔

آج جگدیپ کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ لڑکی اس دھرتی کے رہنے والی نہیں تھی۔ گذشتہ ایک گھنٹہ سے وہ ویسے ہی وہاں بے خیالی کے عالم میں کھڑی تھی جیسے پھولوں کے باغ میں چپ چاپ پھولوں کی ایک اور بیل اُگ آئی ہو اور اپنے گرد و پیش میں اس طرح رچ گئی ہو کہ وہ باقی پھولوں سے الگ نہ ہو۔

دل میں غم و اندوہ کا طوفان لیے ہوئے جگدیپ اپنی جگہ پر بیٹھا رہا ــــ کبھی وہ

دوسرے پیڑوں کی طرح دیکھتا اور کبھی ایک پیڑ کی طرح اُگی ہوئی اِس لڑکی کو دیکھتا اور پھر جگدیپ نے ایک نوجوان کو وہاں آتے دیکھا ___ اس نے لڑکی کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ لڑکی نے چونک کر اور مسکرا کر اس کی طرف دیکھا ___ پھر وہ دونوں وہاں سے چلے گئے۔

جگدیپ نے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی تصویر کو ٹٹولا وہ وہیں تھی ___ جگدیپ نے ٹکٹکی باندھ کر تصویر کی طرف دیکھا کاغذ پر جھیل کا پانی اور پانی میں لرزتی ہوئی پرچھائیں وہیں تھی کہیں چلی نہیں گئی تھی۔

رات کو جب جگدیپ اپنے کمرے میں سونے کے لیے آیا تو اس کی نگاہ باقی کمروں پر بھی پڑی۔ اِس کے کمرے سے تین کمرے چھوڑ کر جو کمرہ تھا اِس میں وہ لڑکی اور اس کا ساتھی وہ نوجوان جو شاید اس کا خاوند تھا قیام پذیر تھے۔

دوسرے دن باغ میں اس نے دو تین آدمیوں کو باتیں کرتے ہوئے سُنا۔

" دیکھا یہاں آئی ہوئی ہے ___ اس کے ساتھ اس کا خاوند بھی ہے "

جگدیپ نے ریکھا کا نام سُن رکھا تھا۔ اسے بہت کم ادیب پسند آئے تھے۔ کہانیوں سے زیادہ شعر و شاعری اس کے لیے زیادہ کشش رکھتی تھی۔ مگر ایسا کبھی کبھی ہوتا تھا۔ جب کوئی نظم یا شعر اسے اپنی رگ و پے میں اترتا ہوا محسوس ہوا کرتا تھا ___ اسے اپنے ملک کے جو ادیب پسند تھے ریکھا ان میں سے ایک تھی ___ اس نے ریکھا کی کچھ کتابیں خرید کر بھی اپنے پاس رکھی ہوئی تھیں ___ " وہی ریکھا ہوگی ضرور وہی ہوگی جس لڑکی کو میں نے کل دیکھا تھا وہ ریکھا کے سوا کوئی دوسری لڑکی نہیں ہو سکتی ___ جگدیپ کا دل اس سے کہہ رہا تھا۔

اس دوپہر کو جگدیپ نے ریکھا کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا — ریکھا اپنے کمرے ہی میں تھی — اس کا خاوند بھی وہیں تھا — دونوں نے بڑے احترام اور تپاک کے ساتھ جگدیپ کو اندر آنے کی دعوت دی۔

"میرا نام جگدیپ ہے۔"

"جگدیپ — مصور؟"

"آپ نے کیا میرا نام سُن رکھا ہے؟"

"حیرانی اس بات پر نہیں ہے — حیرانی تو جب ہوتی اگر نہ سنا ہوتا۔"

"شکریہ۔"

"کئی بار نمائشوں میں آپ کی تخلیقات بھی دیکھی ہیں — چند روز کی بات ہے ایک اخبار نے آپ کی بنائی ہوئی کتنی ہی تصویریں شائع کی تھیں۔

"آپ میرے پسندیدہ ادیبوں میں سے ہیں — اس وقت بھی میرے کمرے میں آپ کی دو کتابیں پڑی ہوئی ہیں۔"

"کیا اب مَیں آپ کا شکریہ ادا کروں —؟"

سب ہی ہنس پڑے — جگدیپ کو ریکھا کا پتی بھی بہت اچھا لگا۔ اس کے رویہ میں قطعاً بیگانگی نہیں تھی — آنے سے پہلے جگدیپ جھجکتا رہا تھا — ریکھا سے نہیں بلکہ اس کے خاوند سے — لیکن وہ تو ریکھا سے بھی کہیں زیادہ بے تکلف تھا — اس نے اپنے نوکر کو آواز دے کر چائے منگوائی اور اپنے ہاتھوں سے جگدیپ کے لیے چائے کی پیالی بنائی۔

"یہاں آپ کتنے دن رہیں گے؟" جگدیپ نے ریکھا کے خاوند سے پوچھا۔

ریکھا کو سارے کشمیر میں یہ جگہ بہت پسند آئی ہے ــــ ہمیں جتنے روز بھی رہنا ہُوا
یہیں رہیں گے ــــ" ریکھا کے خاوند نے جواب دیا۔

جگدیپ کل والا خاکہ اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا اگر یہ خاکہ دکھانا
موزوں ہُوا تو دکھاؤں گا ورنہ واپس اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ لیکن جب یہ خاکہ
دکھانے میں جگدیپ کو جھجک محسوس نہ ہوئی۔

"کل آپ جھیل کے کنارے بہت دیر تک کھڑی رہیں"

"ہاں ــــ وہاں کنارے پر کوئی شخص تصویریں بنا رہا تھا ــــ کیا آپ
ہی تھے ــــ ؟"

"آپ کی پرچھائیں پانی میں پڑ رہی تھیں ــــ میں نے ایک اسکیچ تیار کیا تھا"

جگدیپ نے کاغذ کھولا ــــ وہ کاغذ ریکھا کے پتی نے پکڑ لیا۔

"بہت پیارا ہے ــــ بہت ہی پیارا ــــ" اس نے کہا۔

"اس میں ریکھا جی کو پہچانا نہیں جاتا ــــ صرف ایک پرچھائیں ہے"

"پرچھائیں زیادہ خوبصورت ہُوا کرتی ہے ــــ ریکھا کا پتی بولا۔

"آپ اگر اجازت دیں تو میں کسی دن ان کا اسکیچ بنا دوں"

"ضرور ــــ ضرور ــــ"

چائے ختم ہو گئی ــــ جگدیپ جب وہاں سے چلنے لگا تو ریکھا نے کہا ــــ یہاں
کشمیر آکر آپ نے بہت سی تصویریں بنائی ہوں گی ــــ کسی دن وہ دکھایئے۔"

"جس دن آپ کا جی چاہے ــــ آپ نے کمرے سے چوتھا کمرہ میرا ہے۔
دوسرے دن اور پھر اس سے اگلے دن ریکھا اور اس کا پتی اس کے کمرے میں

آگئے ۔ جگدیپ نے ریکھا کا اسکیچ تیار کر دیا ۔۔۔ سادہ سی پنسل ڈرائنگ تھی اور پھر جگدیپ نے کہا "میں کچھ دن صرف کر کے آپ کی رنگین تصویر بناؤں گا ۔"

"میری تصویر بنانے کی بجائے ۔۔۔"

"ہاں ہاں کہیئے ۔۔۔"

"بہت بڑی بات معلوم ہوتی ہے ۔"

"آپ کہیئے تو سہی ۔"

"اگر آپ میرے کسی گیت کے چند مصرعوں کو ۔۔۔"

"جو مصرعے آپ کو پسند ہوں میں ان کے متعلق بھی تصویر بنا دوں گا ۔"

اور پھر ایک روز ریکھا نے جگدیپ کے کمرے میں آ کر کہا ۔۔۔ "آج مجھے اپنی ساری تصویریں دکھایئے ۔۔۔ بشرطیکہ آپ کے پاس وقت ہو . . . ."

"وہ آپ کے ساتھ کیوں نہیں آئے ؟"

"رات کو تار آیا تھا اور وہ چار پانچ روز کے لیے جموں چلے گئے ہیں ۔"

"آپ اکیلی رہیں گی ۔ ؟"

"ڈر کی کوئی بات نہیں ۔۔۔ پرانا نوکر پاس ہے ۔۔۔ بہت ہی بھلا آدمی ہے ۔

اور پھر چار پانچ روز تک وہ بھی لوٹ آئیں گے ۔"

"میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ۔۔۔"

"آپ نزدیک ہی تو رہتے ہیں ۔۔۔ اگر کوئی ضرورت ہوئی تو ۔۔۔"

جگدیپ نے اپنا سوٹ کیس کھولا ۔ کئی تصویریں تو باہر ہی پڑی تھیں سارا کمرہ کاغذوں سے بھرا پڑا تھا ۔۔۔ میز پر کاغذ ۔۔۔ کرسیوں پر کاغذ ۔۔۔ پلنگ پر کاغذ ۔ ایک تصویر جگدیپ نے دیوار پر لٹکا رکھی تھی ۔۔۔ یہ سب تصویریں ریکھا نے دیکھ رکھی تھیں ۔۔۔ آج جگدیپ اسے سوٹ کیس میں حفاظت سے رکھی ہوئی تصویریں دکھانے لگا ۔۔۔!

"دیوار پر ٹنگی ہوئی یہ تصویر جس کے نیچے "سپنا" لکھا ہوا ہے کس کی ہے ۔؟"

جگدیپ نے اس سوال کا فوراً جواب نہ دیا ۔ کچھ سنبھل کر بولا ۔۔۔ "نوراں کی ہے ۔"

"کون نوراں ۔۔۔ کہاں تھی ۔۔۔؟"

ریکھا جیسی لڑکی کو یہ پوچھنے کی ضرورت نہ تھی ۔۔۔ جگدیپ کی جھکی جھکی نگاہوں نے جو داستان سنائی ریکھا نے وہ سن لی ۔

"کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے کہ تحریر کا ذریعہ اظہار بہت بیگانہ سا ہے ۔"

"مکمل تو کوئی بھی ذریعہ اظہار نہیں ۔۔۔ آپ اپنے باطن سے چاہے کتنا ہی کچھ کیوں نہ باہر نکال لائیں ۔۔۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بات بنی نہیں ۔"

"یہی تو ایک بات ہے جو بار بار لکھنے پر مجبور کرتی ہے ۔۔۔ بار بار ارتقا کا تقاضہ کرتی ہے ۔۔۔ لیکن لفظوں کا سہارا بہت ہی بیگانہ معلوم ہوتا ہے اور بہت ہی ۔"

"کچھ تحریریں ایسی بھی ہوتی ہیں جو آدمی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہیں۔"

"مجھے اپنے کسی کسی مصرعے پر بہت اطمینان ہوتا ہے لیکن کبھی بالکل اطمینان نہیں ہوتا ــــ جیسے لفظوں کی گرفت میں کچھ بھی تو نہ آ رہا ہو۔"

"آپ نے ایک دن کہا تھا کہ میں آپ کے چند مصرعوں کی ــــ آپ کو کونسے مصرعے پسند ہیں ـ؟"

"ایک بھی پسند نہیں ــــ کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں کچھ بھی نہ لکھوں ــــ لکھنا مجھے ــــ"

"آپ کیا کہنے والی تھیں ــــ؟"

"کچھ نہیں۔"

ناقابلِ شکست سکوت مسلط ہو گیا ــــ پھر جگدیپ کو ایک سہارا ہاتھ لگا اور اس نے کہا ــــ "آپ کا وہ مصرعہ ــــ

دل میں دیا جلا کہ کوئی جب بھی سانس لیا کرتا ہے ـ؟"

"اس میں تصویر سے خطاب کیا ہے۔"

"ہاں ــــ"

"ہماری دنیا میں تصور کے کوئی معنی نہیں ہیں ـ دنیا پہاڑے کی طرح ہے جسے کوئی بھی پڑھ سکتا ہے ــــ لیکن تخلیق کے معنی کیے جا سکتے ہیں اور نہ ہی ناپے جا سکتے ہیں۔"

مگر ہم دو پاگل ہو گئے ہیں ــــ تصور کے سہارے ہی جیے جاتے ہیں۔"

جگدیپ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دل کا طوفان کبھی رکا نہیں تھا ــــ اس

کے بدن کو اس طوفان کے تھپیڑے لگتے رہے تھے۔ لیکن کبھی کبھی جب وہ کوئی تصویر بناتا تھا تو اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ طوفان پر کوئی پل بن گیا ہے۔ جس پر کھڑا ہو کر وہ سیلاب کی وسعتوں کو دیکھ سکتا تھا اور تھوڑی دیر کے لیے لہروں کے تھپیڑوں سے بچ سکتا تھا۔

لیکن اس وقت جگدیپ کو یوں لگا کہ اس کے فن کا پل بھی ٹوٹ گیا ہے اور پانی کی لہروں میں اس کے پاؤں اکھڑ رہے ہیں ــــ ریکھا نے یہ کیا کہا تھا ــــ تخیل آپ کے دل میں ایک سوال رکھ دیتا ہے جس کا جواب شاید کوئی نہیں ہوتا۔ جگدیپ سوچا کرتا تھا کہ یہ سوال جیسے اس کے دل ہی میں کھٹکتا رہا تھا ــ صرف اس کے دل میں کھٹکتا رہا تھا ــــ آج اسے پتہ چلا کہ یہ سوال ریکھا کے دل میں بھی کھٹک رہا تھا اور پھر نہ جانے اس جیسے اور ریکھا جیسے کتنے اور لوگ بھی تھے جن کے دلوں میں یہ سوال کسمسا رہا ہوگا اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لیے وہ شعر کہتے ہوں گے ــ کسی کو بھی اس سوال کا جواب نہ ملتا تھا ــ کوئی بھی اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا تھا ــــ یہ سوال کہاں سے دل میں آتا تھا ــ کہاں سے پیدا ہوتا تھا ــــ یہ سوال کہاں سے وجود میں آتا تھا اور کیوں آتا تھا ــــ

"مجھے کچھ کہنا نہیں آتا ــــ صرف سوچنا آتا ہے ــــ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں ــــ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں جو کچھ سوچتا ہوں آپ وہی کچھ کہتے ہیں ــ یہ سوال ہمارے دلوں میں کیوں پیدا ہوتا ہے ــ؟"

"مجھے آج تک پتہ نہیں چلا ــــ میں جو کچھ پڑھتی ہوں ــــ میں جو کچھ لکھتی ہوں ــ یہ سوال اور بھی بڑا ہوتا جاتا ہے اور مجھے اس کا جواب نہیں ملتا ــ"

"لوگ آپ جیسے ادیبوں کے لیے ہی تو کہتے ہیں کہ آپ کے پاس زندگی کے مسئلہ کا حل ہوتا ہے ــــ!"

یہ "حل" کا لفظ مجھے مذاق معلوم ہوتا ہے ــــ میں جوں جوں دیکھتی ہوں میرے دل کا خلاء بڑھتا جاتا ہے ــــ ہر لمحہ طویل ہوتا جاتا ہے ــــ جیسے سارے الفاظ اور ساری باتیں آپ کے گرد شور مچا رہی ہوں ــــ آپ کی شہرت اور آپ کی مقبولیت بھی آپ کو محض ایک غل غپاڑہ نظر آتی ہے ــــ"

ریکھا جیسے ہانپ گئی تھی ــــ وہ تمام تصویروں کو الگ رکھ کر کھڑکی میں جا کر کھڑی ہو گئی تھی اور اس کی نظر سامنے درختوں کے جھنڈ میں کھوئی ہوئی تھی۔

"مجھے آپ اپنی ایک ایسی چیز سنایئے جو آپ کو کبھی کبھی اچھی معلوم ہوتی ہو ــــ" جگدیپ نے بہت دیر کے بعد ریکھا کے پاس کھڑکی میں آ کر کہا۔

"دو چار مصرعے ہیں ــــ کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں نے ان میں کوئی بات کہی ہے۔"

جگدیپ خاموش رہا اور ریکھا نے آہستہ سے یہ مصرعے پڑھے:

یہ میری شب بیدار ہے اور یاد تیری سو گئی

سورج کا رتھ بے بس ہوا کرنیں کسی نے لوٹ لیں

پھینکا کسی نے چاند کا گوٹا فلک سے نوچ لیا

یہ میری شب بیدار ہے اور تیری یاد سو گئی

اس کے بعد نہ جگدیپ سے اور نہ ہی ریکھا سے کچھ کہا گیا۔ نہ جانے کتنے لمحے گذر گئے ــــ جگدیپ نے ایک بار صرف اتنا کہا "میرے پاس الفاظ نہیں ہیں ــــ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

اس رات کو جب جگدیپ اپنے کمرے میں تھا تو اس پر نیند طاری تھی۔ لیکن اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بیدار ہو ـــــ سامنے چاندنی چھٹکی ہوئی تھی ـــــ چاندنی کا ایک بت تھا اور اس کی شکل ایک پیڑ کی طرح تھی ـــــ پھر اس درخت سے جیسے ایک ٹہنی ٹوٹ کے گر پڑی ـــــ اس جگہ اندھیرا ہو گیا ـ پھر دوسری ٹہنی گری اور پھر تیسری۔ دیکھتے ہی دیکھتے چاندنی کی ٹہنیاں ٹوٹتی چلی گئیں ـــــ تاریکی بڑھتی گئی اور پھر اندھیرے میں ایک سیاہ اور دیو قامت پیڑ اس جگہ کو ڈراؤنا اور بھیانک بنانے لگا۔ پھر جگدیپ نے دیکھا اس کے سامنے حسین اور نیلا آسمان پھیلا ہوا تھا چاند پر بھرپور جوبن تھا ـــــ اور پھر کسی نے اپنے ناخنوں سے چاند کو نوچنا شروع کر دیا ـــــ جگدیپ نے گھبرا کر کمرے کی بتی روشن کر دی ـ وہاں اس کے چاروں طرف رنگ برش اور کاغذ بکھرے پڑے تھے۔ نہ ٹوٹی ہوئی کرنیں تھیں اور نہ ادھڑا ہوا چاند تھا ـــــ جگدیپ نے ریکھا کا جو سکیچ بنایا تھا اس کی طرف دیکھا ـــــ وہ ایک خاموش سیدھی سادی گمبھیر لڑکی تھی ـــــ کون جانے اس نے سورج کے رکھ سے کرنیں ٹوٹتی ہوئی دیکھی ہوں ـ اور کون جانے اس نے آسمان کی پوشاک پر سے چاند کا گوٹا کنارہ ادھڑتا ہوا دیکھا ہو۔ جگدیپ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے دل کا سوال پھیل کر بڑا ہو گیا تھا ـــــ اور بھی بڑا ہو گیا تھا ـ

پانچ روز گزر گئے ـــــ ریکھا کے خاوند کا تار آیا کہ وہ اتنا مصروف ہے کہ واپس نہیں آ سکتا۔ اس لیے وہ نوکر کے ہمراہ جموں چلی آئے ـ

ریکھا نے جب اپنا سامان باندھا جگدیپ نے آ کر کہا ـــــ سری نگر سے بس پکڑنے میں آپ کو کوئی تکلیف تو نہ ہو گی ـــــ ؟ اگر اجازت دیں تو میں آپکو سری نگر تک چھوڑ آؤں۔"

" اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو ــــ" ریکھا نے اس سے زیادہ کچھ نہ کہا۔

جگدیپ ریکھا کو چھوڑنے کے لیے سری نگر چلا گیا۔

سری نگر پہنچ کر پتہ چلا کہ بسوں کی آمد و رفت بند تھی ــــ بارش سے اُدھر سڑک ٹوٹ گئی تھی۔

جگدیپ نے ایک نہایت اچھے ہاؤس بوٹ میں ریکھا کی رہائش کا انتظام کر دیا اور ایک چھوٹا ہاؤس بوٹ آپ لے لیا۔ پتہ چلا کم سے کم تین دن تک آمد و رفت نہیں کھُل سکے گی۔

اس رات کو جگدیپ اپنے ہاؤس بوٹ میں سویا پڑا تھا تو اس نے دیکھا کہ ریکھا اُس کے پلنگ سے تھوڑی دور کھڑی ہے ــــ ریکھا کا چہرہ حسین تھا اور وہ ایک دیوی نظر آ رہی تھی ــــ ریکھا کی آنکھوں میں نہ جانے کیا بات تھی ــــ وہ اس سے آنکھیں چار نہ کر سکا ــــ اس نے لجاجت آمیز لہجہ میں کہا ــــ "بیٹھ جائیے"

ریکھا خاموش رہی ــــ بدستور اپنی جگہ پہ کھڑی رہی ــــ اور پھر ریکھا کی دھیمی سی آواز سنائی دی ــــ "میں نوراں کیسے بن جاؤں ــــ؟"

جگدیپ چونک پڑا اور اٹھ بیٹھا ــــ کتنا انوکھا خواب تھا ــــ اس رات کو جگدیپ پھر سو نہ سکا۔

دوسرے دن جگدیپ جب ریکھا سے ملا تو وہ اپنے اچنبے پر قابو پا چکا تھا ریکھا کے ساتھ بیٹھ کر اُس نے کھانا کھایا اور پھر وہ باقی دن گذارنے کے لیے شکارے میں بیٹھ کر ڈل کے کنارے آ گئے اور ایک باغ میں چلے گئے۔

باتیں کرنے کی جیسے ضرورت ہی ختم ہو چکی تھی ــــ یا ضرورتاً اتنی بڑھ گئی تھی کہ

باتیں کرنا یا نہ کرنا ان کے لیے ایک ہی بات تھی ـــــ کافی دیر تک دونوں میں سے کسی نے کوئی بات نہ کی ـــــ ریکھا کو بیٹھنے کے لیے زرد پھولوں والے پیڑ کی چھاؤں بھلی معلوم ہوتی۔

"وہاں بیٹھ جائیں ۔؟"

"ہاں ـــــ"

"کیا آپ پہلے بھی اِس جگہ آئے ہیں ۔؟"

"مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میں آج سے پہلے کہیں بھی نہیں گیا ـــــ"

جگدیپ نے سنجیدگی سے کہا ـــــ ریکھا نے ایک بار اس کی طرف دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہ کہا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے آپ تھک گئے ہیں ـــــ ذرا آرام کر لیجیے ـــــ ریکھا نے کافی دیر کے بعد کہا۔

ریکھا کے نیچے جیسے زرد پھولوں کا قالین بچھا ہوا تھا ـــــ جگدیپ نے درخت کے تنے سے اپنی پیٹھ لگا دی اور کہا:

ہوا سے کوئی نہ کوئی پھول ٹوٹ کر گر پڑتا ہے ـــــ میرا جی چاہتا ہے اتنے پھول گریں میں ان میں دفن ہو جاؤں ـــــ پھولوں کی ایک قبر بن جائے اور میں قبر میں سویا رہوں"۔

ریکھا خاموش رہی ـــــ پھول گرتے رہے ـــــ جگدیپ پر بھی اور ریکھا پر بھی۔

دوپہر کی دھوپ میں شام کا اندھیرا گھل گیا۔

"کیا چلیں ـــــ؟"

"چلو ـــــ"

گھنٹوں کے بعد ان دونوں نے ایک دوسرے کی آواز سُنی ـــــ

بارہ دری کی پتھر سے بنی ہوئی دیواروں کو لوگوں نے کُھرچ کُھرچ کر اپنے نام کندہ کر دیے تھے ـــــ جگدیپ کو ایسا معلوم ہُوا جیسے نگاہوں کے قدموں میں کنکر آ گئے ہوں ـــــ!

"اِس طرح اپنا نام لکھنے میں شاید کسی کو اطمینان ہوتا ہو ـــــ" جگدیپ نے کہا۔

"بیچارے لوگ ـــــ دلوں کی دیوار پر نام کندہ نہیں کر سکتے ـــــ زمانہ کی دیوار پر نام ثبت نہیں کر سکتے ـــــ جھوٹی تسلیاں ڈھونڈتے پھرتے ہیں ـــــ"

ریکھا نے آہستہ سے کہا ـــــ باغ سے لوٹتے ہوئے ریکھا سرو کے ایک پیڑ کے پاس کھڑی ہو گئی ـــــ سرو کے پتوں کو کافی دیر تک اپنی مٹھی میں رکھنے کے بعد انہیں چھوڑ دیا ـــــ ان پتوں سے لگے ہوئے سبز سبز دانے توڑ کر اپنی دونوں مٹھیاں بھر لیں ـــــ باغ سے باہر آنے پر ریکھا نے اپنی مٹھیاں جگدیپ ہتھیلیوں پر انڈیل دیں ـــــ جگدیپ نے سارے دانے اپنی جیبوں میں ڈال لیے۔

ریکھا کو اس کے ہاؤس بوٹ میں چھوڑ کر اور کھانا کھا کر جگدیپ جب اپنے ہاؤس بوٹ میں آیا تو اس نے جیب سے سارے دانے نکال کر میز پر رکھ دیے اور پھر نہ جانے اِسے کیا خیال آیا اس نے اپنے سوٹ کیس میں سے سُوئی اور دھاگا نکالا اور ان کی ایک مالا بنا دی۔

•

دوسرا دن ریکھا اور جگدیپ نے جس باغ میں گزارا اِس کے کنارے بارہ دری کا ایک گوشہ ابھی تک ثابت کھڑا تھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر جب ریکھا اور

جگدیپ اوپر گئے تو اس کا ایک گوشہ ایک چھوٹی سی کھڑکی کی طرح تھا ـــ اس کھڑکی میں کھڑے ہو کر جگدیپ چونک پڑا ـــ گزشتہ رات کو جگدیپ نے خواب دیکھا تھا کہ ایک گھنے جنگل میں ایک چھوٹی سی جھونپڑی ہے ـــ سرکنڈوں کی چھت اور مٹی سے لیپی پوتی ہوئی دیواریں ـــ وہ اور ریکھا دونوں اس جھونپڑی میں کھڑے ہو کر ادگرد پھیلے ہوئے گھنے جنگل کو دیکھ رہے تھے۔ جگدیپ کو ایسا معلوم ہوا کہ ٹوٹے ہوئے پتھروں کی اس بارہ دری کا یہ گوشہ ایک جھونپڑی تھا جہاں وہ ریکھا کے پاس کھڑا ہوا گھنے جنگل کی طرف کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو ـــ" ریکھا نے آہستہ سے پوچھا ـــ

"آج مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں ایک ہی دن میں سن رسیدہ ہو گیا ہوں"

جگدیپ نے اس کے سوا کچھ نہ کہا۔

اس شام کو جب ریکھا اور جگدیپ واپس آئے تو ان کا کہیں بیٹھ کر چائے پینے کو جی چاہا۔

ایک اچھا ہوٹل نظر آیا ـــ اندر گئے ـــ ان کی خواہش تھی کہ ہوٹل میں زیادہ بھیڑ نہیں ہونی چاہیئے ـــ کمرے میں لوگوں کا ہجوم تھا ـــ ایک طرف میز خالی پڑی تھی ـــ وہ اس کے گرد جا بیٹھے ـــ چائے ابھی تک نہیں آئی تھی۔ لیکن لوگوں کی نگاہیں ان کی طرف پہلے ہی آ گئی تھیں۔

جگدیپ اور ریکھا نے لاکھ کوشش کی کہ انہیں چائے کی پیالیوں کے سوا کچھ نظر نہ آئے لیکن آپس میں باتیں کرتے ہوئے بھی انہیں کوئی نہ کوئی دبی ہوئی آواز سنائی دے رہی تھی ـــ ریکھ ـــ شاعر ـــ اور اپنے خیالات میں محو۔ جگدیپ اور ریکھا

کو لوگوں کی نگاہیں اپنے بدن پر چبھی ہوئی محسوس ہوتیں۔
چائے کی پیالی ختم ہوتے ہی ریکھا اٹھ کر کھڑی ہو گئی — جگدیپ نے اپنی پیالی آدھی خالی چھوڑ دی — چائے کا بل ادا کیا اور وہ دونوں باہر آ گئے۔
شکارے میں بیٹھ کر جب وہ دونوں ہاؤس بوٹ میں واپس آئے تو ریکھا نے کہا — "عورت ہونا بھی ایک مصیبت ہے — بہت بڑی مصیبت"
اگلے روز ریکھا کو وہاں سے چلے جانا تھا — اس رات کو جگدیپ سو نہ سکا — ذرا سی دیر کے لیے آنکھ لگتی تو اسے ریکھا کا چہرہ دکھائی دینے لگتا اور پھر دیکھتے دیکھتے اس کا چہرہ نوراں کے چہرے میں تبدیل ہو جاتا — جگدیپ چونک کر آنکھیں کھول کر دیکھتا — اٹھ کر کافی دیر تک ہاؤس بوٹ کی بیں کھڑا رہتا — باہر ڈل کا پانی بھی پرسکون نہیں تھا — جیسے اس کے پیروں کو ٹکنے کے لیے جگہ نہ مل رہی — جگدیپ پھر اپنے پلنگ پر آ جاتا — ذرا سی دیر کو آنکھ لگتی — نوراں کا بھولا اور معصوم چہرہ اس کے سامنے آ جاتا اور پھر اس کے معصوم چہرے پر ویران متانت پھیل جاتی۔ اور وہ چہرہ ریکھا کا بن جاتا۔
صبح ہوئی تو جگدیپ ریکھا کے ہاؤس بوٹ میں پہنچا — ریکھا اپنا سامان باندھ رہی تھی۔
"کیا میرا اسکیچ مجھے نہیں دیجیے گا — ؟" ریکھا نے کہا۔
"میں ساتھ لے کر آیا ہوں"
"اور وہ دوسرا — ؟"
"کون سا — ؟"

بیل اور پرچھائیں والا "

"پرچھائیں میرے پاس ہی رہنے دیجیے"

ریکھا خاموش ہو گئی ــــ سامان سمیٹتی رہی ــــ نوکر نے میز پر چائے رکھ دی - ریکھا نے دو پیالیاں بنائیں اور پلیٹ میں بھنے ہوئے بادام ڈال کر کہنے لگی ــــ "زندگی کی چنگاری بڑی ظالم ہوتی ہے"

"سارا فن اسی باطنی چنگاری سے پیدا ہوتا ہے"

"جیسے زندگی کو فن عزیز ہو اور انسان عزیز نہ ہو"

"شاید ــــ"

انسان چاہے ساری عمر اس چنگاری سے جلتا رہے۔ زندگی فن کی تعمیر کرتی رہتی ہے ــــ کون جانتا ہے کہ انسان کو فن کی کتنی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے ــــ اس بات کا علم ہوتا ہے کہ دھوپ سے چمکتی ہوئی ریت پانی نہیں ہوتی لیکن زندگی ریت ہی کو پانی کی طرح چھلکا دیتی ہے۔ انسان کے پیچھے دوڑنے لگتا ہے ــــ" ریکھا نے چائے کی دوسری پیالی بناتے ہوئے کہا ــــ "کل رات کو مجھے ایسا دکھائی دیا جیسے ریگستان میں چنبیلی کے پھول کھل اٹھے ہیں ۔

ہر طرف سفید کلیاں ــــ جدھر بھی نگاہ اٹھے ــــ دودھ جیسے سفید کلیاں دکھائیں دیں ــــ اور میں نے کلیاں توڑ توڑ کر اپنی جھولی بھر لی ــــ اور پھر مجھے دکھائی دیا ــــ بہت کچھ دکھائی دیا ــــ میں صبح کو اُٹھ کر لکھتی رہی ــــ" ریکھا نے ایک کاغذ جگدیپ کے ہاتھ میں دے دیا۔

جگدیپ نے پڑھا۔

ورنہ اپنا بند کر اے زندگی

جذبِ دل کی لاج رکھ !

رتیلے میدان سے آتی ہوئی

سن ذرا آوازِ پا سن تو سہی

زندگی اپنا نہ درد تو بند کر

کر لے ایک پل کیلئے ہی انتظار

لاکھ اندھیرے پار کرتی چیرتی

آ رہی ہے روشنی کی ایک لکیر

ورنہ اپنا بند کر اے زندگی !

خیمۂ خس سے ویراں ہے، ایک جھونپڑی

انجم تاباں جلاتے ہیں الاؤ !

چاند کے لب پر صلائے عام ہے

درد اپنا بند کر اے زندگی

دیکھ تو مڑ کر ذرا تو ایک بار

ماتھے پہ کرنوں کا سہرا باندھ کر

آگیا پھر آفتاب زرنگار

ورنہ اپنا بند کر لے زندگی

ایک لمحہ کے لیے اب رک بھی جا

عشق ہاتھوں میں ہے ایک کاسہ

زندگی تو بھیک اس میں ڈال

جگدیپ کا سر جھک گیا ــــ وہ ہاتھوں میں پکڑے ہوئے کاغذ تک سرنگوں ہو گیا ۔

نوکر نے میز پر سے خالی پیالیاں اٹھالیں ــــ رخصت کی گھڑی آگئی تھی ۔
کیا میں اسے رکھ لوں ــــ ؟ جگدیپ نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذ طرف دیکھ کر کہا ۔

"ہاں ــــ" ریکھا نے اس سے زیادہ کچھ نہ کہا ۔

"یہ میرے لیے زندگی کا پیغام ثابت ہوگا ۔"

"زندگی کا ہر ایک پیغام ایک فریب ہوتا ہے ــــ ایک چھلاوہ ــــ"

اس کے بعد دونوں خاموش رہے ــــ ہاؤس بوٹ کا کرایہ ادا کرنے کے بعد ریکھا اور جگدیپ لاریوں کے اڈہ پر آگئے ــــ ریکھا کے لیے جگدیپ نے سیٹ ریزرو کروا رکھی تھی ــــ لاری چلنے کا وقت ہو گیا اور جب چل دی تو سڑک پر اُڑتی ہوئی دھول دیکھ کر جگدیپ کو یوں محسوس ہُوا جیسے آج دوسری بار وہ نوراں کو گم کر بیٹھا تھا ــــ !

اب کے جگدیپ نے چچی سے یہ وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ کشمیر سے لوٹتا ہوا گاؤں آئے گا اور پھر دلّی جائے گا — چچی نے اُس سے کہا تھا۔

میری ویراں سے ملاقات ہوئی تھی — وہ کسی کی شادی پر یہاں آئی ہوئی تھی — تجھے بہت یاد کرتی تھی۔"

"کیا خوش تھی —؟"

"بہت — اس پر تو جیسے دوبارہ شباب آگیا ہے۔"

"سچ —!"

"کہتی تھی — میں دیپ کا احسان نہیں چکا سکتی — اس نے تو مجھے نئی زندگی دیدی ہے۔"

"کیا روپے پیسے سے اس کا ہاتھ تنگ تو نہیں تھا؟"

"نہیں — کہتی تھی کہ انہوں نے پڑوس کے گاؤں میں کافی زمین خریدی ہے۔ ہیروں جیسے دو بیٹے ہیں اس کے — تجھے رہ رہ کر یاد کرتی تھی اور کہتی تھی دیپ سے کہنا کہ ایک بار مجھے آکر منہ تو دکھا جائے۔"

"اچھا چچی کبھی ہو آؤں گا۔"

اس وقت تو نوراں کے غم نے اسے کہیں نہ جانے دیا ۔۔۔ اب کشمیر سے لوٹتے ہوئے جگدیپ کو اپنا وعدہ یاد آیا اور وہ اپنے گاؤں چلا آیا۔

جگدیپ چار پانچ روز کے لیے اپنی چچی کے پاس رہا اور پھر چھوٹی شاہنی کے گاؤں کا پتہ پوچھ کر وہ اس سے ملنے کے لیے چلا گیا۔ اِدھر اُدھر سے پوچھتے ہوئے اُس نے اِس کا گھر ڈھونڈ لیا۔

"میں قربان جاؤں ۔۔۔ میرا دیپ۔!" شاہنی کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔"

"خیریت تو ہے شاہنی ۔۔۔؟"

"مجھے شاہنی کہہ کر کیوں بلا رہا ہے ۔۔۔ میں تو تیری ویراں ہوں ۔۔۔۔ وہی ویراں ۔۔۔"

"تو سچ مچ شاہنی ہے ویراں ۔۔۔ آدمی دل سے دولت مند ہوتا ہے۔"

"میں تو بھکارن تھی دیپ ۔۔۔ تو نے سیٹھانی بنا دیا۔"

ویراں نے دالان میں نواڑی پلنگ بچھا دیا ۔۔۔ اندر سے نئی اور کوری چادر بچھانے کے لیے نکال لائی۔

"تو نے تو مجھے بھلا ہی دیا دیپ ۔۔۔!" ویراں دودھ کا گلاس لائی اور جگدیپ کے قریب آکر بولی۔

"اتنی دور سے تجھے ملنے آیا ہوں ۔۔۔ بھلا کیسے دیا۔؟"

"سنا ہے اب تو بہت بڑا آدمی بن گیا ہے۔"

"ناپ کر دیکھ لو کہ میں کتنا بڑا ہو گیا ہوں۔"

"تو تو ویسا ہی دیپ ہے ــــ میں سوچتی تھی کہ اب تو ہم سے بات کرنا بھی گوارا کرے گا کہ نہیں "

"کیوں مجھے اب کیا ہو گیا ہے "

اب تو اخباروں میں تیری تصویریں چھپتی ہیں ــــ ہمارے گاؤں میں بھی اخبار آتا ہے ــــ جب میں نے پہلی بار تیری تصویر دیکھی تو سب کو دکھاتی پھروں "میرا دیپ ــ میرا دیپ ــ !" میں نے بڑی حفاظت سے ٹرنک میں رکھی ہوئی ہے "

"سچ جگدیپ ہنس پڑا ۔

"میں پوچھتی ہوں کیا اب تو شادی نہیں کرے گا ــ ؟ کیا بوڑھا ہو کر بیاہ کرائیگا؟"

"مجھ سے کوئی شادی کرواتا ہی نہیں "

"رہنے بھی دے ــ تجھے باتیں بہت آتی ہیں ــــ یوں کیوں نہیں کہتا کہ کوئی لڑکی تیری نظر پر چڑھتی ہی نہیں "

"سچ کہہ رہا ہوں نظر پر تو چڑھتی ہیں ــــ مگر "

"مگر کیا ــ ؟"

"وہ لڑکیاں یا تو کسی اور سے بیاہ کر لیتی ہیں یا کسی نے پہلے ہی سے شادی کر رکھی ہوتی ہے ــــ " جگدیپ کھلکھلا کر ہنس پڑا ۔

"تو باتیں بہت بناتا ہے ــــ شہر میں رہ کر تجھے بہت باتیں آ گئی ہیں "

"تجھے بھی تو آ گئی ہیں ــ پہلے تو بات نہیں کیا کرتی تھی "

"چل ہٹ ــــ " ویراں شرما گئی ۔

"بچے کہاں ہیں۔؟"

"تجھے یہ کس نے بتایا کہ ۔۔۔" ویراں حجاب کے مارے سُرخ ہو گئی۔

"اچھا یہ تو بتا تیرے بچے رشتہ میں میرے کیا ہوئے۔؟" جگدیپ نے از راہِ مذاق پوچھا۔

"میں نے تیری تصویر انہیں دکھائی تھی اور کہا تھا یہ تمہارا ماموں ہے ۔۔" ویراں کی ہنسی نکل گئی۔

"کون سے رشتہ سے میں ان کا ماموں ہوا ۔۔؟" جگدیپ نے آہستہ سے ویراں کی پیٹھ پر مکّے مارتے ہوئے کہا۔

"بس بیٹھا بھی رہ ۔۔" ویراں ہنسی کے مارے دُوہری ہوئی جا رہی تھی۔

"اچھا انہیں دکھا تو سہی ۔۔۔ مجھ سے کیوں چھپا رہی ہے۔؟"

"ننھیال گئے ہوئے ہیں ۔۔۔ شاید رات لوٹ آئیں ۔۔۔ ان کا باپ انہیں اپنے ساتھ لانے کے لیے گیا ہوا ہے۔!"

ویراں اٹھنے لگی تو جگدیپ نے اس کا بازو پکڑ لیا "کیا باتیں کر کے پیٹ بھر گیا؟"

"ذرا چوکے کی خبر تو لوں ۔۔۔ کیا تو باتوں سے روٹی کھائے گا؟"

"روٹی تو روز کھانے کو مل جاتی ہے ۔۔۔ یہ تیری باتیں نہیں مل سکیں گی۔"

جگدیپ ہنسنے لگا ۔۔۔ ویراں کو خوش دیکھ کر وہ بھی آج بہت خوش تھا وہ کچھ اس طرح خوش تھا جیسے کوئی اپنی بیٹی اور بہن کو خوش دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔

"وہاں میرے پاس آکر بیٹھ جا ۔۔۔ مونڈھا بچھائے دیتی ہوں ۔۔۔" ویراں نے چوکے میں مونڈھا ڈال دیا اور جگدیپ کو اپنے پاس بلا لیا۔ وہ خود دہلیز میں بیٹھ کر دال

کی چھٹائی کرنے لگی۔

ویراں نے دال چولھے پر رکھ دی ـــــ آلو بھونے ـــــ میٹھی سوّیاں بنائیں اور ساتھ ہی ساتھ چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی رہی۔

"کیا تو مجھے اپنی شادی پر بلائے گا ـــــ شہر کی لڑکیاں کیسی ہوتی ہیں ـ؟ ان کو کہیں زیادہ غرور تو نہیں ہوتا ـــــ؟ تیری چچی کہہ رہی تھی کہ تجھے ولایت جانا ہے ـــــ وہاں سے کوئی میم نہ لے آنا۔"

جگدیپ ہنستا رہا ـــ کبھی اس کی کسی بات کا جواب دیدیتا اور کبھی خاموش رہتا ـــ توے پر سے پراٹھے اتار کر ویراں نے جگدیپ کے لیے کھانا پروس دیا۔

"پہلے سب کا انتظار کرلیں ـــــ پھر اس کے بعد کھانا کھائیں گے۔"

"نہ جانے وہ کب آئیں ـــــ اور پھر میری ماں انہیں کھانا کھلا کر ہی بھیجے گی انہیں یونہی نہیں آنے دے گی۔"

"اچھا تو پکا لے ـــــ میں اور تو ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائیں گے۔"

"ارے ـــــ گرم گرم روٹی کھالے۔

"اونہہ ہوں۔"

ویراں نے شکست مان لی ـــ جب اُس نے چار پانچ پراٹھے پکا لیے تو وہ بولی ـــــ "امّاں اور بیٹیا مل کر روٹی کھائیں۔"

جگدیپ نے نوالہ توڑتے ہوئے کہا ـــــ "پہلے مجھے یہ بتا کہ تو میری ماں ہے، بہن ہے کہ بیٹی ہے ـ؟"

"میں تیری سب کچھ ہوں ـــــ" ویراں کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں ـــــ

رات کا ہلکا سا دھندلکا پھیل چکا تھا جب ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا۔ دیراں کے دونوں بچے اور ان بچوں کا باپ آپہنچے تھے۔

"ذرا بتاؤ تو سہی ـــــ ہمارے گھر کون آیا ہے ؟"

"میں بتاؤں ـــ ؟" بھگت رام کی آواز آئی۔

"تم بتا ہی نہیں سکتے۔"

"اگر بتا دوں تو ـــــ"

"ایک ایک روپے کی شرط۔"

"لاؤ روپیہ نکالو۔"

"میں کیوں نکالوں ـــــ تم نکالو۔"

"تجھے دینا ہوگا۔ اور دودھ میں دھو کر دینا ہوگا ـــــ"

"اچھا دو دو روپے کی شرط رہی ـــــ"

"جگدیپ آیا ہے۔"

"تمہیں کس نے بتایا ـ ؟" دیراں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اگر جگدیپ نہ ہوتا تو شرط ہی کیوں لگاتی ـــــ" بھگت رام نے ہنستے ہوئے کہا جگدیپ چارپائی پر سے اٹھ بیٹھا ـــــ بھگت رام اس سے یوں بغل گیر ہوا جیسے مدت کے بچھڑے ہوئے دوست ملتے ہیں۔

دونوں بچے جگدیپ کی طرف چپ کھڑے دیکھ رہے تھے ـــــ باری باری جگدیپ نے ان کو اپنی گود میں اٹھا لیا۔

"ان سے تو میری اب دوستی ہو جائے گی ـــــ" جگدیپ نے کہا اور کشمیر سے

لایا ہوا پھلوں کا بکس کھولنے لگا۔

بھگت رام سے جب تک ملاقات نہیں ہوئی تھی جگدیپ کے دل میں ذرا سی جھجک تھی لیکن بھگت رام کی ہر ایک بات سے لسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس کا پرانا دوست ہو ــــ بھگت رام نے اپنے ہاتھوں سے خریدی ہوئی زمین اور فصلوں کی بات اس انداز سے چھیڑی جگدیپ کو بار بار یہ خیال آتا انسان کا دل سیر ہو تو وہ کیا کارنامہ سر انجام نہیں دے سکتا۔

شرخ آلو بخارے کھلتے ہوئے بچے جگدیپ کے ساتھ یوں باتیں کر رہے تھے جیسے اس کے ساتھ ان کی پرانی جان پہچان ہو۔

دوسرے دن صبح کو جگدیپ کو وہاں سے روانہ ہونا تھا لیکن جب ویراں نے اس کا بازو پکڑ کر اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کر اس سے کہا ــــ آج کا دن اور رُک جاؤ ــــ پھر جیتے جی نہ جانے کب ملاقات ہو ــــ تو جگدیپ انکار نہ کر سکا۔

دوسرے دن جگدیپ روانہ ہوا تو اُس نے ویراں کو اپنی آغوش میں لیکر پیار کیا ــــ وہ کچھ اس طرح خوش تھا جیسے کوئی اپنی بہن اور بیٹی کو خوش دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔

جگدیپ نے دلی آکر سب سے پہلی جو تصویر بنائی وہ سرو کے پیڑ کے نیچے کھڑی ہوئی ریکھا کی تھی ـــــ وہ سوئی دھاگا لیکر پیڑ کے سبز دانوں کی مالا پرو رہی تھی ـــــ تصویر میں اس نے ریکھا کا چہرہ زیادہ تر پتوں کی اوٹ میں دکھایا تھا ـــ وہ جانتا تھا کہ لوگ جب چہروں کو پہچان لیتے ہیں تو اُن کی آنکھوں میں کانٹے اُگ آتے ہیں اور جب وہ دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھتے ہیں تو جیسے کانٹے چبھوتے ہیں وہ ریکھا کے چہرے پر کسی کی نگاہ نہیں پڑنے دینا چاہتا تھا۔

زرد پھولوں کے پیڑ کے نیچے کھڑے ہوئے دو بُت بنائے جن کے قدموں تلے پھولوں کا فرش تھا اور جن کے سر پر پھولوں کی بارش ہو رہی تھی۔

ایک تصویر میں جگدیپ نے بادلوں کی طرح اندھیروں کے جھرمٹ بنائے اور روشنی کی ایک مہین اور باریک لکیر بنائی جو اندھیروں کی گھنی تہوں کو چیر رہی تھی۔ اس کے نیچے جگدیپ نے نہایت پتلی سطر لکھی :

"لاکھ اندھیرے پار کرتی چیرتی ، آ رہی ہے روشنی کی ایک لکیر"

جگدیپ تصویریں بناتا جا رہا تھا اور اس کا سوال عظیم ہوتا جا رہا تھا ـــــ

اسے محسوس ہوتا کہ روشنی کی لکیر نے ظلم ڈھایا تھا ــــ اس نے اس پہ یہ بات عیاں کی تھی کہ اس کے اندھیرے کتنے گہرے اور بیکراں تھے ــــ روشنی کی یہ لکیر کچھ ایسی تھی جیسے ہر لمحہ کسی کی کمی یا کوتاہی کی طرف انگلی سے اشارہ کر رہی ہو۔

نمائش گیلری کے منتظمین نے اسے خط لکھا کہ وہ اس کی تصویروں کی نمائش منعقد کر رہے ہیں ــــ ساتھ ہی ساتھ اسے خبروں کی فلم بنانے والوں نے لکھا کہ وہ اگلے ہفتہ اس کے سٹوڈیو میں آکر فلم تیار کریں گے ــــ اپنی سب سے پسندیدہ تصویر کو آگے رکھ کر اگر وہ مصور کی فلم بھی لے رکھیں تو یہ ایک نہایت اچھی بات ہو گی۔

جگدیپ کو جب بھی اپنی پسندیدہ تصویر کا انتخاب کرنا ہوتا وہ بہت سی تصویریں اپنے سامنے رکھ لیتا اور اس کی نگاہ ایک ہی جگہ جا کر ٹھہر جاتی ــــ ستاروں کی پوشاک پہن کر ایک خواب کی طرح کھڑی ہوئی نوراں۔

جگدیپ کی زندگی میں یہ تیسرا موقع تھا جب اس نے سوچا کہ وہ اس تصویر کو دوبارہ بنائے۔

ہر آنے والے برس پر اسے یوں معلوم ہوتا جیسے وہ گذشتہ برس جتنا اچھا فنکار نہیں تھا ــــ اپنی پہلی تخلیقات کے متعلق اس کا اطمینان اطمینان نہ رہتا ــــ فن اسے اپنے ہاتھ کے اشارہ سے اپنے پاس بلاتا ــــ وہ آگے بڑھتا مگر فن اس سے بھی آگے بڑھ جاتی۔

اب کے جب جگدیپ نے نئی تصویر بنائی تو نوراں کے بھولے اور معصوم خدو خال میں دیکھا کے چہرے کی متانت بھی سرائت کر گئی ــــ ایک دیوی جیسے اس پر اپنا سایہ ڈال رہی ہو۔ نوراں اور دیکھا مل کر ایک ہو گئی تھیں ــــ جگدیپ ان میں

امتیاز نہیں کر سکتا تھا۔

فلم نمائش کی گئی ـــ جگدیپ کے سٹوڈیو کی دیواروں سے لٹکی ہوئی ـــ تصویروں اور کینوس پر کام کرتے ہوئے فن کار کی فلم ـــ کام کرتے ہوئے مصور کی انہوں نے تصویر کھینچی تو اس میں کینوس پر مصور کے ہاتھ کو سامنے رکھا مصور کو نہیں ـــ اس تصویر میں جگدیپ کی پیٹھ نظر آرہی تھی ـــ عقب میں اونچی جگہ کیمرہ رکھ کر یہ تصویر اتاری گئی تھی۔

بیچارے لوگ ـــ دل کی دیوار پر اپنا نام نہیں کندہ کر سکتے ـــ زمانہ کی دیوار پر اپنا نام ثبت نہیں کر سکتے ـــ جھوٹی تسلیاں ڈھونڈتے پھرتے ہیں ـــ یہ ریکھا کے یہ الفاظ جگدیپ کو یاد آگئے ـــ آج کی فلم میں اسے ایک بات اچھی لگی ـــ فلم میں اس کا چہرہ سامنے نہیں تھا۔ اس کا فن سامنے تھا۔ نوراں اور ریکھا کا چہرہ ـــ جیسے زمانہ کی دیوار پر ان کا نام کندہ ہو گیا ہو۔

جگدیپ اپنے کاموں کو جوں جوں پھیلاتا جا رہا تھا اس کے دل کی ویرانی گھنی ہوتی جا رہی تھی ـــ بعض اوقات ریکھا کے یہ الفاظ اس کے جگر کے پار ہو جاتے ہیں کبھی کبھی ایسا وقت بھی آتا ہے جب آپ کی تخلیق آپ کا مذاق اڑاتی ہے۔"

لوگ جگدیپ سے کہا کرتے تھے کہ تیری قسمت کی ریکھا بہت روشن ہے ورنہ جینے جی فن کاروں کو کون پوچھتا ہے ـــ" جگدیپ کے دل میں ایک جملہ ہلچل پیدا کر دیتا ـــ اس کی ہتھیلی پر کوئی ریکھا کیوں نہیں تھی ـــ ریکھا کی ریکھا ـــ اور اسے اپنی ہتھیلی بالکل خالی نظر آتی۔

دوسرے دن صبح کو نو بجے نمائش کی افتتاحی تقریب تھی ـــ اس رات جگدیپ

کا سٹوڈیو تصویروں سے خالی تھا ـــــ سب ہی تصویریں نمائش کی گیلری میں لیجائی
گئی تھیں تاکہ لوگ ان کے دام لگائیں۔

خالی سٹوڈیو میں بیٹھے ہوئے جگدیپ کو یوں معلوم ہوا جیسے اس کے ارد گرد ایک سنسان
ویرانی تھی ـــــ بھیانک ویرانی ـــــ اور پھر اس ویرانی میں سوچ کی ایک لہر اٹھی
ـــــ دوسری پھر تیسری ـــــ چاروں طرف جل تھل ہوگیا۔

جگدیپ کے پاؤں اکھڑ گئے ـــــ کوئی لہر اسے دھکیل کر ادھر لے جاتی اور کوئی
ادھر ـــــ اس کا دل ان لہروں کے رحم وکرم پر تھا۔

اندھیرا بڑھتا گیا ـــــ لہریں اور بھی بلند اور بھی سیاہ اور بھی ڈراؤنی ہوتی گئیں۔
جگدیپ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی آخری گھڑی آ پہنچی ہو ـــــ اس نے اپنا سب
کچھ ان لہروں کے حوالے کر دیا ـــــ اس کا سارا جسم لہروں کے تھپیڑوں سے ہانپنے لگا۔

پھر ایک جل پری نے ان لہروں کو ریزہ ریزہ کر دیا ـــــ اس کے پیروں
میں پڑے ہوئے گھنگرو بج اٹھے ـــــ اس کے سارے جسم پر پانی کے قطروں کی
پوشاک تھی جس میں سے اس کے سیپیوں کی طرح سفید اور چمکدار جسم کی آنچ آ رہی تھی۔
اس نے جگدیپ کو اپنی باہوں میں لے لیا ـــــ لہروں کے تھپیڑے نرم پڑ گئے ـــــ
پھولوں کی پتیوں کی طرح نرم اور ملائم اور وہ جل پری کی باہوں میں پتیوں پر پڑی
ہوئی شبنم کی طرح تھا۔

جل پری نے اپنے ہونٹوں کو جھکایا ـــــ مزید جھکایا ـ جگدیپ کو یوں لگا کہ اس
کے ہونٹوں کو نرم اور ٹھنڈے ہونٹ چھو رہے تھے۔

"کیا تم خوش نہیں ہو ـــــ" جل پری کی آواز آئی۔

"تم کون ہو"

"میں تمہیں پیار کرتی ہوں"

"مجھے ـــــ" "ہاں ـــــ"

"تم نوراں تو نہیں ہو ـــــ؟"

"نہیں ـــــ میں نوراں نہیں ہوں ـــــ"

"تم دیکھا بھی نہیں ـــــ"

"نہیں میں دیکھا بھی نہیں ـــــ"

"پھر کون ہو ـــــ؟"

"میں تمہیں پیار کرتی ہوں"

"میں نے تمہیں کبھی دیکھا ہی نہیں"

"مجھے اسی بات کا تو دُکھ ہے تم میری طرف دیکھتے ہی نہیں ـــــ"

"تم کہاں رہتی ہو"

"تیرے چاروں طرف ـــــ"

"جھوٹ ـــــ"

"تم مجھے ایک حقیقت کیوں نہیں مانتے"

"میں صبح کو تمہارے ساتھ ہوں گی ـــــ"

"صبح کو ـــــ"

"صبح کے نو بجے ـــــ"

"کل صبح تو میری تصویروں کی نمائش دکھائی جا رہی ہے"

"ہمارے دیش کا سب سے بڑا آدمی اس نمائش کا اُگھاٹن کریگا ـــــ میں خوشبو کی طرح تمہارے اردگرد پھیل جاؤں گی ۔"

"خوشبو ـــــ"

"تم ایک پھول ہو ـــــ اور میں تمہاری مہک ہوں ۔"

"تمہارا نام کیا ہے ـــ؟"

"شہرت ۔"

"شہرت ـــ؟"

"میں تمہیں دنیا کا وردان کر ملی ہوں ۔"

"وردان ـــ"

"تم مجھے دیکھتے ہی نہیں ـــ کتنے ہی فن کار ریاضت کرتے ہوئے مر جاتے ہیں۔"

"میں ان سے کبھی نہیں ملتی ـــ"

"لیکن میں نے تو کوئی وردان نہیں مانگا تھا ـــ"

"جو لوگ میرے پیچھے دوڑتے ہیں میں ان کو کبھی نہیں ملتی ـــ میں تمہیں اسی لیے ملی ہوں کہ تم نے مجھے مانگا نہیں تھا ـــ"

"اور میں نے جو کچھ مانگا تھا ـــ؟"

"تم نے کیا مانگا تھا ـــ؟"

"تم نے ابھی ابھی کہا تھا کہ میں ایک پھول ہوں ۔"

"ہاں ـــ؟"

"میں نے مانگا تھا کہ کوئی مجھے توڑ لے ـــ مجھے اپنے بالوں میں گوندے اور

میں اس کے بالوں سے چمٹا ہوا ختم ہو جاؤں "

"جانتے ہو پھر کیا ہوتا ــــ؟"

"کیا ہوتا ــــ؟"

"اس کی مہک صرف ایک ــــ صرف ایک انسان کو آتی ــــ!"

"ہاں ــــ"

"لیکن اب تمہاری مہک سارے باغ میں ساری دنیا میں پھیلے گی "

"مگر مجھے کیا ملے گا ــ؟"

"نیک نامی "

"یہ درد دان واپس لے جاؤ ــــ"

"نہیں ــــ"

"یہ درد دان ایک پتھر ہے جو میری زندگی سے اٹھایا نہیں جاتا "

"زندگی زیادہ دن تو نہیں رہتی ــــ چالیس ــــ زیادہ سے زیادہ پچاس سال ــــ ساٹھ برس ــ لیکن میں ابد تک تمہارے ساتھ وابستہ ہوں گی"

"جب میں نہیں ہوں گا تو پھر میں اپنے نام کو کیا کروں گا ــــ میں تمام عمر تمہارا بوجھ اٹھاتا مر جاؤں گا "

"تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتا ــــ میں تم پر مہربان ہوں ــــ تمہارا درد دان ہوں ــــ"

"درد دان نہیں شراب ــــ"

اور جگدیپ نے جل پری کی باہوں کی گرفت سے خود کو آزاد کرانے کی

کوشش کی۔

جب وہ اپنے بازوؤں کا پورا زور لگا رہا تھا اس کی آنکھ کھل گئی۔ صبح کی روشنی کھڑکی سے گزر اس کے کمرے میں پھیل چکی تھی — جگدیپ نے ایک نگاہ اپنے کمرے میں دوڑائی — کمرہ تصویروں سے خالی تھا — اس کے دل سے ایک ٹیس اٹھی — "آج اس کی تخلیقات بھی اسے تنہا چھوڑ کر لوگوں کے پاس اپنی قیمت لگوانے چلی گئی تھیں۔

پریم نے جگدیپ کو آ ... دیکھا تو وہ حیران رہ گیا۔

"آٹھ بج چلے ہیں جگدیپ ۔۔۔"

"اچھا۔۔۔!"

"تمہارا نوکر دوبارہ تمہاری چائے لایا تھا ۔۔۔ پڑی پڑی ٹھنڈی ہو جاتی ہے اور تم پیتے ہی نہیں ۔۔۔"

"پی لوں گا ۔"

"نو بجے سے دس منٹ پہلے ہی ہمیں وہاں پہنچنا ہے ۔"

"اچھا ۔"

"لوگ تم پر رشک کر رہے ہیں ۔"

"کیوں ۔۔؟"

"کیا یہ پوچھنے کی بات ہے ۔۔۔؟ تمہاری جو عمر ہے اس میں کیا کسی فن کار کو اتنی شہرت نصیب ہوئی ہے ۔۔۔ شہرت جیسی ۔۔۔ شہر کے تمام مصور تمہارا نام سن کر جل بھن رہے ہیں ۔"

پریم نے زبردستی جگدیپ کا بازو پکڑ لیا اور تولیا اس کے ہاتھ میں تھما کر اسے غسل خانے کی طرف بھیج دیا۔

نو بجنے میں ابھی پانچ منٹ باقی تھے جب جگدیپ کو ساتھ لیکر پریم نمائش کی گیلری میں پہنچا ۔۔۔ فوٹوگرافروں کے کیمروں میں بلب بار بار جل اٹھتا تھا اور بجھ جاتا تھا ۔۔۔ جگدیپ کو یوں محسوس ہوا جیسے ایک ایک کر کے تارے اس کے

آسمان پر نکل رہے تھے اور ٹوٹتے جا رہے تھے۔

ملک کے ہر دل عزیز وزیر کو دیکھنے کے لیے جگدیپ کے دل میں مدت سے ایک خواہش انگڑائی لے رہی تھی — آج وہ ہر دلعزیز وزیر اس کی تصویروں کی نمائش کا اُدگھاٹن کرنے کے لیے آیا تھا — اس نے جگدیپ کے گرد اپنا بازو ڈال کر اپنے پہلو سے چپٹا لیا اور پھر نمائش کی گیلری کے دروازے پر لگے ہوئے ربن کو کاٹ دیا —

جگدیپ کو ایک بار تو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا آسمان بے پناہ روشنی سے جگمگا اٹھا ہو۔ دوسرے لمحہ ہی وہ سورج ڈھل گیا اور آسمان پہلے سے بھی زیادہ تاریک ہو گیا،

گیلری میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہی — کسی کی آنکھیں ایک تصویر پر جمی ہوئی تھیں تو دوسرے کی کسی اور تصویر پر۔

"جگدیپ —" ایک دبی ہوئی آواز سنائی دی۔

"ریکھا —" جگدیپ نے دیکھا ریکھا اس کے کندھے کے پاس کھڑی ہوئی اسے آواز دے رہی تھی۔

"یہ تمہیں کیا ہو گیا ریکھا —" جگدیپ سے دیکھا نہ گیا۔

ریکھا کا چہرہ نہ جانے کون سے مرض سے نچڑ گیا تھا — سیاہ رنگ کا شال اس نے لپیٹ رکھا تھا اور لڑکی نے اسے بازوؤں کا سہارا دے رکھا تھا۔

"انہیں ایک برس سے بخار آ رہا ہے۔ آج بھی ان میں اٹھنے کی ہمت نہیں تھی لیکن آنے پر بضد تھیں —" ریکھا کی سہیلی نے کہا۔

جگدیپ سے کچھ کہا نہ گیا۔

"میں آج بہت خوش ہوں جگدیپ — میں آج کا دن دیکھنے کی بہت مشتاق تھی۔ میرے ساتھ چل کر مجھے اپنی تمام تصویریں دکھاؤ۔

جگدیپ کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے آنسوؤں نے اس کی آنکھیں بند کر دی تھیں اور اس کے ہونٹوں میں جنبش کی سکت نہیں تھی۔

"یہ زرد پھولوں والا درخت ـــــ یہ تصویر کب بنائی تھی ـــ؟" ریکھا آہستہ آہستہ چلتی رہی اور تصویریں دیکھتی رہی۔

یہ ہاؤس بوٹ ـــ یہ بارہ دری کی کھڑکی ـــ یہ تصویر بہت پیاری ہے جگدیپ ـــ تاریکیوں کی تصویر ـــ تاریکی کی کیسے تہہ پر تہہ چڑھی ہوئی ہے ـــ" تصویر کے نیچے ریکھا نے پڑھا۔

لاکھ اندھیرے پار کرتی چیرتی
آ رہی ہے روشنی کی اک لکیر

یہ اس کا اپنا شعر تھا۔

اپنے شال کے پلّو سے ریکھا نے ایک بار اپنی آنکھیں پونچھیں۔

سامنے "سپنا" عنوان کی تصویر ٹنگی ہوئی تھی ـــ ستاروں والی پوشاک پہن کر کھڑی ہوئی ایک دوشیزہ۔

"کیا یہ وہ تصویر تو نہیں جو اچھابل میں تمہارے کمرے کے اندر ٹنگی ہوتی تھی"؟

"نہیں ـــ دوبارہ بنائی ہے"۔

نہ ریکھا قدم اٹھا سکی نہ جگدیپ ـــ اور پھر جگدیپ نے آہستہ سے کہا ـــ!

"کیا آپ کو اس میں کوئی فرق نظر آتا ہے۔؟"

"ہاں ـــ"

"بھلا کیا ـــ؟"

"آپ نے جیسے ایک چہرے میں دوسرا چہرہ سمو دیا ہو"

ایک بار تو جگدیپ کو یوں لگا جیسے اس کا تیر نشانے پر بیٹھا ہو ـــــ ریکھا نے نوراں کے چہرے میں جذب اپنا چہرہ پہچان لیا تھا ـــــ دوسرے ہی لمحہ جگدیپ کے دل میں ایک سوال نے سر اُبھارا ـــــ "کیسا نشانہ ـــــ کیسی جگہ ـــــ اس ضرب کے لیے ریکھا کے پاس کونسی جگہ ـــــ اور زندگی کے پاس کونسی جگہ ہے ـ؟"

اگلی تصویر سرو کے پیڑ کے پاس کھڑی سبز دانوں کی مالا پروتی ہوئی ایک دوشیزہ کی تھی۔"

"سرو کے دانے ـــــ" ریکھا نے کہا۔

مالا تو میں نے خود پرو دی تھی ـــــ آپ نے نہیں ـــــ جگدیپ نے غمزدہ ہوکر کہا۔

ریکھا نے بڑی دیر تک کوئی جواب نہ دیا ـــــ اور پھر آہستہ سے کہا ـــــ تیرے پاس مالا پرونے کے لیے ہاتھ ہی کہاں تھے۔"

ریکھا سے کھڑا نہ رہا گیا ـــــ اس نے دلیپ اکا سہارا لیا ـــــ ریکھا کی سہیلی نے منت سماجت کرتے ہوئے کہا ـــــ "آؤ واپس چلیں ـــــ تکلیف بڑھ جائے گی"۔

"کہاں جانا ہے ـــــ؟"

"میں یہیں دلّی میں ہوں۔"

"کب سے ـ؟"

"چار مہینے ہو چکے ہیں۔"

"چار مہینے ـــــ؟"

"وہ کہتے تھے یہاں اچھے ڈاکٹر ہیں۔"

"مجھے اپنا پتہ کیوں نہ دیا ـــــ؟"

ریکھا نے کافی دیر تک چپ رہنے کے بعد کہا ـــــ "میں سوچتی تھی کہ آپ مجھے بیماری کی حالت میں نہ دیکھیں تو اچھا ہے۔"

"پاگل ——" جگدیپ کے منہ سے نکل گیا۔

سہیلی نے ریکھا کا بازو پکڑ لیا اور اسے وہاں سے چلنے کے لیے پھر زور دیا۔

"کیا میں آپ کے ساتھ چلوں ——؟" جگدیپ نے پوچھا۔

"نہیں —— آپ کو یہیں رہنا چاہیئے —— یہ تمام لوگ آپ ہی کے لیے تو یہاں آئے ہوئے ہیں۔"

"مجھے یہاں کیا کرنا ہے —— تصویریں لگی ہوئی ہیں —— لوگ دیکھتے رہیں گے۔"

جگدیپ نے ریکھا کی طرف اس طرح دیکھا کہ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے دنیا میں ایک لمحہ کے لیے زندگی بسر کر لی ہو ——!

ریکھا کی سہیلی نے اسے اپنے بازوؤں کا سہارا دیے رکھا اور ریکھا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی باہر کے دروازے کے پاس آ گئی —— جگدیپ اس کے ساتھ تھا۔

"میں نے آپ کی ایک تصویر تو پہلے بھی دیکھی تھی لیکن آج ساری کی ساری دیکھ لی ہیں ——" ریکھا کی سہیلی نے جگدیپ سے کہا۔

"ایک تصویر پہلے دیکھی تھی —— کب ——؟"

"میرے ساتھ چلو گے ——؟" ریکھا نے آہستہ سے کہا۔

ریکھا کی سہیلی نے ریکھا کی طرف ہاتھ کا اشارہ کیا اور جگدیپ سے کہا —— ریکھا بھی تو ایک تصویر ہے —— اور تمہاری ہے ——"

جگدیپ کو یوں محسوس ہوا جیسے دنیا کی سب سے بہتر تصویر پر کسی نے اس کا نام لکھ دیا ہو۔

اس نے ریکھا کو آہستہ سے اپنے پہلو کے ساتھ لگا لیا۔

اس روز جگدیپ جب ریکھا کو چھوڑ کر اپنے گھر لوٹ رہا تھا تو راستہ میں بارش آگئی — مینہ کی بوچھاڑ کچھ اتنی تیز تھی چار قدم چلنا بھی محال ہو گیا۔ سڑک سے گذرتے ہوئے لوگوں نے پاس کی دکانوں کے برآمدوں میں جا کر پناہ لی — لیکن جس جگہ جگدیپ موجود تھا۔ وہاں آس پاس کوئی برآمدہ نہیں تھا — ایک پیڑ تھا — جگدیپ اس کے نیچے جا کھڑا ہوا — بارش تھی کہ ایک بہت بڑا طوفان تھا — درخت کے نیچے کھڑا ہوا جگدیپ بارش سے شرابور ہو گیا — سردیوں کے دن تھے — اس کا بدن کانپنے لگا — نزدیک کوئی جائے پناہ نہیں تھی — سڑک پر سے کچھ کاریں گذر رہی تھیں — جہاں جگدیپ کھڑا تھا وہاں سے بائیں طرف سڑک کا چوک تھا — سامنے کچھ کاریں رک گئیں — کانسٹیبل کا ہاتھ دوسری طرف تھا اور جن لوگوں کی کاریں رک گئی تھیں وہ اپنی طرف ہاتھ کے اشارے کا انتظار کر رہے تھے۔ سامنے سرخ رنگ کی ایک کار میں جگدیپ نے دیکھا رمندر بیٹھی ہوئی تھی — اگلی نشست پر — کار وہ خود چلا رہی تھی — ڈرائیور پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا — اسے دیکھے ہوئے کئی برس ہو چکے تھے مگر جگدیپ نے اسے پہچان لیا — اور پھر رمندر کی نگاہ بائیں طرف پڑی۔ پیڑ تلے — جہاں جگدیپ کھڑا تھا — رمندر نے چونک کر دیکھا — جگدیپ کو

اب اس بات میں شک نہ رہا — رمندر نے بھی اسے پہچان لیا تھا — ایک جھٹکے کے ساتھ رمندر نے اپنا منہ پھیر لیا — کانسٹیبل نے ہاتھ سے اشارہ دیا اور رمندر نے تیزی کے ساتھ اپنی کار اس کے آگے سے گذار لی۔

مینہ میں تر ابور اور سردی سے کانپتے ہوئے جگدیپ کو ہنسی آ گئی — اسے یاد آیا کہ رمندر کے ماڈل سے اُس نے جو پہلی تصویر بنائی تھی اس کا نام اُس نے "دنیا" رکھا تھا — اس وقت اسے معلوم نہیں تھا دنیا کا برتاؤ کیسا ہوتا ہے" — دنیا اسے خرید لینا چاہتی تھی — اسے اپنا غلام بنا لینا چاہتی تھی — اس کے "خواب" کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتی تھی — پھر جگدیپ کو ایسا معلوم ہوا جیسے دنیا تاش کے پتوں کا ایک کھیل ہو — رمندر — رمندر — تاش کے پتوں کا ایک کھیل اس کے پتے ہی چھوٹے تھے — وہ کیا کر سکتا تھا — کوئی بھی ذہانت اس کے چھوٹے پتوں کو بڑا نہیں کر سکتی تھی۔

پھر ایک خالی ٹیکسی گذری — جگدیپ نے ہاتھ کا اشارہ کیا — ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے گھر آ گیا۔

اس رات پریم نے اس سے آ کر کہا۔

"صبح تم نے یہ کیا کیا — ؟"

"کیوں — کیا ہوا — ؟"

"تم نمائش کی گیلری سے چلے کیوں آئے — ؟"

"اس میں ایسی کون سی بات ہے"

"لوگ باتیں بنا رہے تھے"

"لوگوں کا اس بات سے کیا واسطہ ہے؟"

"تم نہیں سمجھتے جگدیپ ـــ لوگ تو کوئی بات چاہتے ہیں۔"

"وہاں لوگ کہاں تھے ـــ فن کار تھے یا فن کے پرکھنے والے ـــ میں چلا آیا ـــ انہیں مجھ سے کیا لینا تھا ـــ میرا فن تو وہیں تھا۔"

"اس دنیا میں فن کار ہوتے ہی کتنے ہیں ـــ؟ فن کے پرکھنے والے کتنے ہوتے ہیں ـــ؟ بار بار ریکھا کا نام لے رہے تھے۔"

"ریکھا کا۔"

وہ بھی تو تمہارے جتنی شہرت کی مالک ہے ـــ ویسے کسی نے دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو ـــ مگر تصویروں سے تو پہچان جاتے ہیں ـــ کئی بار اخباروں میں اس کی تصویریں چھپ چکی ہیں۔"

"تو پھر کون سا گناہ ہو گیا ـــ ریکھا بیمار ہے ـــ آنٹی بیمار ہے کہ۔"

"لوگ کسی کے دکھ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے جگدیپ۔"

"آج مجھ سے کچھ نہ کہو پریم۔"

جگدیپ گھنٹہ بھر مینہ میں بھیگتا رہا تھا ـــ اسے ہلکا ہلکا بخار ہو گیا۔

پریم نے اسے برانڈی دی اور کمرے میں کوئلوں کی انگیٹھی جلا دی۔

پریم گزشتہ تین برس سے جگدیپ کے گھر ہی میں رہ رہا تھا ـــ تین برس ہو گئے تھے جب جگدیپ اپنے فلیٹ کے دو کمرے بند کر کے اور تیسرا کمرہ پریم کو دے کر دکن کی طرف چلا گیا تھا ـــ پریم تب سے وہیں رہ رہا تھا ـــ جگدیپ جب واپس آیا تھا تو اس وقت دلّی میں مکان ملنے دشوار ہو گئے تھے ـــ ویسے بھی جگدیپ کو پریم اچھا لگتا

تھا ــــ وہ کوئی فن کار نہیں تھا ــــ ایک سرکاری دفتر میں کام کرتا تھا مگر اس کے پہلو میں فن کاروں کا دل تھا ــــ رات کو جب کبھی جگدیپ فارغ ہوتا تو وہ اسے کتابوں کے حسین اور نفیس جملے سنایا کرتا ــــ جگدیپ کو وہ بہت اچھا لگتا تھا۔

اس رات پریم اپنے کمرے میں نہ گیا ــــ جگدیپ کے پلنگ کے پاس پڑے ہوئے صوفے پر سو گیا ــــ آدھی رات گئے پریم نے اٹھ کر دیکھا جگدیپ تیز بخار میں بھُن رہا تھا۔

دوسری صبح کو جگدیپ نے پریم سے کہا کہ وہ اس کے لیے ایک ٹیکسی منگوا دے۔

"مرنے کی اتنی جلدی نہیں کرنی چاہیئے ــــ" پریم نے برہم ہو کر کہا۔

اور پھر جگدیپ کو چائے کی پیالی دیکر کہنے لگا ــــ میں آدھ گھنٹے میں آجاؤں گا ــــ دفتر چھٹی کی درخواست دے آؤں گا ــــ اور آتے ہوئے ڈاکٹر کو بلا لاؤں گا ــــ اگر تم نے یہاں سے ہلنے کی کوشش کی تو ۔ ۔ ۔ ۔"

"لیکن پریم ــــ"

"اچھا ــــ تم مجھے اس کے گھر کا پتہ بتا دو ــــ میں ریکھا کو مطلع کر دوں گا"

"نہیں ــــ نہیں ــــ وہ تو بیچاری خود بیمار ہے"

شام تک تمہارا بخار اتر جائے گا چچا جان ــــ کل صبح چلے جانا ــــ پریم نے کمبل جگدیپ کے گرد اچھی طرح لپیٹتے ہوئے کہا ــــ اگر تم نے ضد کی تو میں باہر تالا لگا کر جاؤں گا"

پریم چلا گیا ــــ آدھ گھنٹہ یا چالیس منٹ گذرے ہونگے۔ جب پریم نے الٹے پاؤں کمرے میں آکر اس کے ماتھے پر اپنا ہاتھ رکھ ــــ "ڈاکٹر صاحب آئے ہیں"

"ڈاکٹر ——؟"

"کیا اندر لے آؤں"

"لے آؤ ——"

پریم نے مونڈھا پلنگ کے پاس سرکا دیا اور جب وہ کمرے سے باہر جانے لگا۔ تو جگدیپ نے اسے آواز دی۔

"کیا بات —؟"

"اُدھر گئے تھے —!"

"کدھر ——؟"

"مجھے کیوں تنگ کر رہے ہو"

"ابھی وقت نہیں ملا —— تھوڑی دیر تک جاؤں گا ——" پریم ہنس دیا۔

جگدیپ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ دیکھا کمرے کی دہلیز تک پہنچ گئی۔

"ڈاکٹر صاحب آگئے ہیں"

"تم ہو ریکھا ـ ؟"

"یہ بخار کہاں سے آ گئے ـ ؟"

"کچھ نہیں ریکھا —— مگر تم کیوں آئیں ـ ؟"

"آج میری طبیعت ذرا اچھی تھی —— بہت ہی اچھی"

"اگر پھر خراب ہو گئی تو ـ ؟"

"نہیں ہوتی —— آج نہیں ہوتی —— ریکھا صوفے پر بیٹھ گئی ـ

پریم شاید چائے بنانے کے لیے چلا گیا تھا ـ

"تم شاید بارش میں بہت بھیگ گئے ـ ؟ ریکھا نے آہستہ سے کہا ـ

جگدیپ کو کل کی بارش یاد آ گئی —— اور پھر بارش میں بھیگتے اور سردی سے کانپتے ہوئے اس کے پاس سے رمندر کا منہ پھیر کر اور کار گزار کر سے جانا یاد آیا ـ

اسے خیال آیا —— جب کوئی دنیا کا غلام نہیں بنتا دنیا اس سے منہ موڑ لیتی ہے ـ !

دنیا لاکھ منہ پھیرے —— میں اپنے سپنے کو ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہونے دوں گا ——"

جگدیپ اندر اندر بل کھانے لگا ـ

"ایسی بارش روز ہو ——" جگدیپ ہنس پڑا ـ

"اور روز بخار ہو جائے ۔۔۔"

"ہاں ۔۔۔ اور روز کوئی خبر گیری کے لیے آئے۔"

"تم پتلون پہن کر کیوں سوئے ہوئے ہو ۔۔۔ کیا اس طرح تکلیف نہیں ہوتی"۔

"نہیں دیکھا ۔۔۔ میں ہمیشہ اسی طرح سویا کرتا ہوں ۔

"پتلون پہن کر ۔۔۔" دیکھا جیسے حیران رہ گئی ۔

جگدیپ ہنس پڑا ۔۔۔ "میری ایک ذہنی پیچیدگی ہے دیکھا ۔۔۔ میں پاجامہ پہن ہی نہیں سکتا ۔۔۔ بالخصوص دھاری دار پاجامہ"

"کیسی ذہنی پیچیدگی ۔۔۔؟"

"قصہ سنا دوں ۔"

"نہ سنانے والی ایسی کون سی بات ہو سکتی ہے"

"بات کوئی بڑی نہیں ۔۔۔ لیکن اپنے پیچھے گہرا نشان چھوڑ گئی ہے ۔ میں جب نیا نیا شہر میں آیا تھا تو اپنے سکول میں پاجامہ پہن کر گیا تھا ۔ دھاری دار پاجامہ ۔۔۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ شہر میں لوگ دھاری دار پاجامہ سونے سے پہلے پہنتے ہیں"

"پھر کیا ہوا ۔۔۔" دیکھا ہنس پڑی ۔

"مجھے یہ بات بتاتا کوئی نہیں تھا ۔ لیکن سب ہی لڑکے میری طرف دیکھنے اور ہنستے ایک دن گزر گیا ۔۔۔ دو دن گزر گئے ۔۔۔ تین دن گزر گئے ۔۔۔ لڑکے میری طرف یوں دیکھتے ۔۔۔ میرا جی چاہتا میں اسکول سے بھاگ جاؤں ۔۔۔" جگدیپ ہنسنے لگا

میری ڈرائنگ اتنی اچھی تھی ۔۔۔ میرے ماسٹر نے میری کاپی بورڈ سے لگا کر سب کو دکھائی ۔ میری پیٹھ پر کچھ ایسی تھپکی دی کہ اس کے سامنے رو پڑا ۔۔۔ اور اپنا دل

کھول کر رکھ دیا۔"

"اس نے بتایا ہوگا کہ ــــ"

"ہاں ریکھا ــــ میں نے اگلے دن سے پاجامہ پہننا ہی چھوڑ دیا ــــ اور پھر اس کے بعد باہر تو کیا گھر میں بھی نہیں پہن سکا ــــ سوتے ہوئے بھی نہیں ــــ دھاری دار تو خیر پہننا ہی نہیں تھا سفید پاجامہ بھی نہیں پہن سکا۔"

ریکھا اتنے بڑے مصور کی اتنی بڑی ذہنی پیچیدگی پر کھلکھلا کر ہنس پڑی ــــ اور اسے جگدیپ کے دل کی سادگی اس کے تمام فنون سے عظیم معلوم ہوئی ــــ اتنے میں پریم نے آکر کہا ــ "ڈاکٹر آگیا ہے ــ!"

"تم نے کتنے ڈاکٹر بلوائے ہیں ــــ؟" جگدیپ ہنس پڑا۔

"اب میں ایک نقلی ڈاکٹر لایا ہوں ــــ" پریم بھی ہنس پڑا۔

ڈاکٹر نے آکر پانچ سات منٹ تک اسے دیکھا ــــ تھرمامیٹر لگایا اور پھر ریکھا کی طرف منہ کر کے کہا ــــ "تین تین گھنٹوں کے بعد خوراک دیدیجیے گا ــ اگر سر میں درد زیادہ ہو تو تھوڑی سی وکس مل دیجیے گا۔"

"بہت اچھا ــــ" ریکھا نے آہستہ سے کہا اور سر جھکا لیا۔

ڈاکٹر چلا گیا ــــ پریم بھی اس کے ساتھ دوا لانے چلا گیا ــــ جگدیپ نے دیکھا ریکھا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے ــــ دونوں نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکے ــــ جگدیپ نے ریکھا کا ہاتھ تھام لیا ــــ ریکھا نے اپنا سر مونڈھے سے لگا دیا ــــ آنسوؤں کے کتنے ہی قطرے ریکھا کے چہرے کو بھگو گئے۔

پریم نے پندرہ بیس منٹ کے بعد آکر دوا اور وکس کی شیشی میز پر رکھ دی

اور ہنس کے ریکھا سے کہنے لگا ـــــ تین تین گھنٹوں بعد خوراک دیدیجے گا ـــ اگر سر میں درد زیادہ ہو تو تھوڑی سی وکس مل دیجیے گا"

ریکھا ہنس پڑی ۔

"تم کہاں جارہے ہو ـــ ؟" جگدیپ نے تنک کر پریم سے کہا ۔

"دفتر سے چھٹی نہیں ملی ـــ دفتر جارہا ہوں"

"چل ہٹ ـــ بیٹھ جا یہاں ـــ"

تینوں ہنس پڑے اور پریم ایک کرسی پر بیٹھ گیا ۔

ریکھا نے جگدیپ کو دوا کی خوراک دے کر کہا ـــ "سر میں درد زیادہ تو نہیں ہو رہا ۔ ؟"

جگدیپ ـــ "نہیں" کہنے ہی والا تھا مگر اس کی ہنسی چھوٹ گئی اور وہ بولا ۔

"سر میں سخت درد ہو رہا ہے"

ریکھا ہنس پڑی مگر اپنی نرم اور دبلی انگلیوں سے جگدیپ کی پیشانی پر وکس ملنے لگی ۔

پریم نے نوکر سے جاکر کہا کہ وہ چائے تیار کر کے لے آئے ـــ جب چائے آئی تو ریکھا سے چائے کی پیالی لے کر جگدیپ نے کہا ـــ "جن کی آپ خاطر و مدارات ہو وہ بھلا اچھا کیوں ہونے لگا"

بیماری سے ریکھا کا رنگ کچھ سنولا گیا تھا ـــ ریکھا کی باہوں سے جگدیپ نے اپنی باہیں ماپ کر کہا ـــ "ان چاروں بانہوں کا رنگ ایک سا ہے ریکھا ـــ بتاؤ تمہاری کونسی ہیں اور میری کونسی ۔ ؟"

پہلے تو ریکھا کے جی میں یہ آیا کہ وہ کہہ دے "چاروں تمہاری ہیں" لیکن ریکھا کے چہرے پر اداسی کی ایک اور سانولی پرچھائیں پڑی اور اس نے اپنے دونوں بازوؤں کی طرف دیکھ کر کہا ــــ "اب یہ بازو میرے نہیں ہیں ــــ" اور پھر ایک سرد آہ بھر کر وہ جگدیپ کے بازوؤں کی طرف دیکھتی ہوئی بولی ــــ "اور یہ بازو میرے بن نہیں سکتے۔"

جگدیپ ریکھا کی یہ افسردگی برداشت نہ کر سکا ــــ! اس نے اپنے بازو ریکھا کے بازوؤں پر لپیٹ دیئے۔

اور پھر جو بات ریکھا کہنے لگی تھی اس کے ہونٹوں پر آ گئی ــــ "چاروں تمہارے ہیں۔"

ریکھا کو وہاں آئے ہوئے تین گھنٹے ہو گئے تھے اور ریکھا کی سہیلی اسے ساتھ لے چلنے کے لیے آ گئی۔

"ڈاکٹر دو بجے آئے گا انجکشن لگانے ــــ اس کا فون آیا تھا اور اب ایک بج چکا ہے ــــ سہیلی نے ریکھا سے کہا اور پھر جگدیپ کا حال پوچھنے لگی۔

"تم نے ڈاکٹر کو شام کا وقت دیدیا ہوتا ــــ" ریکھا نے کہا۔

میں نے بہت کہا مگر ڈاکٹر مانا ہی نہیں ــــ اور پھر اس سے کہتی کیا کہ مریض گھر میں نہیں ہے ــــ" سہیلی نے آہستہ سے ریکھا کا ہاتھ دبایا۔

پریم ایک چھوٹی ٹیکسی لے آیا ــــ ریکھا جب جانے لگی تو جگدیپ کو ایسا محسوس ہوا جیسے زندگی میں پہلی بار تین گھنٹوں کے لیے اس کا گھر آباد ہوا۔

ایک آدھ دن میں جگدیپ کا بخار اتر گیا ___ اب وہ ہر روز دن میں ایک بار ریکھا کو دیکھ آتا تھا ___ ریکھا کے گھر میں صرف اس کا پتی تھا۔ نوکر تھے اور سہیلی تھی ___ سہیلی نے جیسے خود کو ریکھا کے لیے وقف کر دیا تھا ___ اس کا خاوند آج کل لندن میں تھا اور اس نے اپنے خاوند کو لکھ دیا تھا کہ جب تک ریکھا بیمار ہے وہ اپنے گھر میں نہیں رہے گی ___ ریکھا کے پاس رہے گی۔

زندگی میں جگدیپ کے پھر چلے آنے سے ریکھا کے چہرے پر رونق آ گئی تھی جیسے زندگی نے اسے چند روز کی بھیک دے دی ہو۔ مگر زندگی اتنی مہربان نہیں تھی جتنا کہ سب نے سوچ رکھا تھا۔ ایک دن اچانک ہی ریکھا کو متلی ہوئی ___ متلی میں خون تھا ___ ڈاکٹر بھی ناامید ہو گیا۔

جب سے جگدیپ اپنی ماں سے محروم ہوا تھا تب سے اسے خدا پر یقین نہیں رہا تھا۔ جگدیپ کو محسوس ہوتا تھا ___ خدا کسی کا نہیں ___ خدا بچوں کی بھی نہیں سنتا ___" اس کے بعد اس نے خدا سے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔

___ آج جگدیپ کی زندگی میں دوسری بار امتحان کی گھڑی آئی تھی ___ اس کے دل کے درد نے خدا سے کہا ___ آج تجھے پھر آزماؤں گا۔ ؛ تو نے ایک بچے کے پاکیزہ دل کی لاج نہیں رکھی تھی ___ آج محبت کے پاکیزہ اور مقدس دل کی لاج رکھے گا۔

یا نہیں ۔؟ ریکھا کو زندگی دیدے ـــــ میں دنیا میں کسی کا دل نہیں دکھاؤں گا ـــــ
میں کبھی ریکھا کے خاوند کا بھی دل نہیں دکھاؤں گا ۔"

ایک دن ریکھا میں پلنگ پر سے اٹھنے کی بھی سکت نہیں تھی مگر اس نے جگدیپ سے کہا ـــــ "میرا جی تمہارے سٹوڈیو میں جانے کو چاہتا ہے ۔"

"اس حالت میں ـــــ؟"

"نمائش ختم ہو گئی کیا ۔؟"

"کبھی کی ۔"

"کیا تصویریں واپس آ گئی ہیں ۔؟"

"ہاں ـــــ"

"میرا انہیں دیکھنے کو جی چاہتا ہے ـــــ سب ہی تصویریں دیکھنے کو جی چاہتا ہے ۔"
زرد پھولوں والے پیڑ کی تصویر ـــــ ہاؤس بوٹ والی ـــــ سرو کے پیڑ والی ۔

"میں سب تصویریں یہاں لے آؤں گا ۔"

"میرا جی چاہتا ہے کہ تم میرے سامنے بیٹھ کر ایک تصویر بناؤ ۔"

"میں یہیں بنا دوں گا ۔"

"نہیں ـــــ ایسے نہیں ـــــ یہاں تو میں چارپائی پہ پڑی ہوں ۔ تمہارے سٹوڈیو میں بیٹھ کر! ـــــ کیا تمہیں یاد ہے ایک بار تم نے مجھے ایک بات سنائی تھی ۔"

"کون سی ۔؟"

"اپنے گاؤں کے مکان کی بالائی منزل میں بیٹھ کر تم نے نوراں کی تصویر بنائی تھی!"

"ہاں"

"اس نے ستاروں والی چنری اوڑھی ہوئی تھی۔ میں بھی ستاروں والا دوپٹہ اوڑھونگی۔

" ریکھا " جگدیپ کے آنسو اس کی آنکھوں میں لرزنے لگے۔

دوسرے دن کشمیر میں بنائی ہوئی تمام تصویریں اپنے یہاں سے لاکر جگدیپ نے ریکھا کے کمرے میں لگا دیں ریکھا نے ان کی طرف بار بار دیکھا اور پھر کہا "کیا تمہیں یاد ہے زرد رنگ کے پھولوں والے درخت کے نیچے بیٹھ کر تم نے کیا کہا تھا۔؟"

"یاد ہے ریکھا"

"تم نے کہا تھا پھول گریں اور اتنے گریں میں ان کے نیچے دب جاؤں پھولوں کی قبر بن جائے اور میں قبر میں سویا رہوں۔"

"آج زیادہ باتیں نہ کرو ریکھا تمہاری طبیعت اچھی نہیں۔"

"آج تم پھولوں سے کہو کہ وہ میری چارپائی پر گریں اور اتنے گریں کہ پھولوں کی قبر بن جائے۔"

جگدیپ نے اپنی ہتھیلی ریکھا کے ہونٹوں پر رکھ دی۔

دیدی کوئی اخبار والا آیا ہے آپ کی مزاج پرسی کے لیے انٹرویو لینے آئے ہیں۔ ریکھا کی سہیلی نے آکر کہا۔

ان سے کہہ دو کہ میں اس وقت پھولوں کی باتیں کر رہی ہوں ــــ دو کوڑی کی باتیں کرنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے "

ریکھا کی سہیلی سے اپنے آنسو نہ پیے گئے اور وہ اُلٹے پاؤں واپس چلی گئی ۔

دوسرے دن جگدیپ جب آیا تو اس نے ریکھا کے پلنگ کے پاس پڑی ہوئی میز پر پھولوں کا ڈھیر لگا دیا ریکھا نے کئی بار ان پھولوں سے اپنی مٹھیاں بھر لیں ۔ مٹھیاں بھر لیتی ــ کھول دیتی اور پھر بھر لیتی ۔

"آج میں بہت خوش ہوں ــــ گذشتہ رات مجھ کو یہی محسوس ہوتا رہا جیسے میں زرد رنگ کے پیڑ کے نیچے سوئی پڑی ہوں ــــ میرے نیچے پھولوں کا فرش ہو اور میرے اوپر پھولوں کی چادر ہو ــ !"

"کیا تمہیں وہ تصویر یاد ہے ریکھا ـــ سپنا ـــ؟"

ہاں ــــ ستاروں کی پوشاک والی ـــ پہلے وہ صرف نوراں تھی پھر تم نے اس میں میری صورت بھی سمو دی تھی "

"سرکار نے "نیشنل آرٹ گیلری" کے لیے مانگ لیا ہے "

"اچھا تو زمانہ کی دیوار پر میرا نام بھی لکھا گیا ـــ !" ریکھا ہنس پڑی ــــــ مگر زندگی کی دیوار پر اپنا نام کوئی نہیں لکھ سکتا دیپ ــــ زمانے کی دیواروں کا کوئی کیا کرے ــــ ریکھا کی آنکھوں میں ڈبڈبا آئے ۔

جگدیپ سے کچھ نہ کہا گیا۔

تم نے ستاروں والے دوپٹہ کے ساتھ میری ایک تصویر بنائی ہے نا"

جگدیپ اپنی زبان سے کچھ نہ کہہ سکا ۔ —— صرف سر کو جنبش دیتے ہوئے اس نے کہا "ہاں"

اس رات ریکھا کو خون آلود متلی آئی اور بیہوش ہوگئی —— دوسرے دن صبح کو جب جگدیپ آیا ریکھا بیہوش تھی اور اس کے ارد گرد ڈاکٹر ہی ڈاکٹر تھے۔

ریکھا کا سانس اکھڑ گیا —— جگدیپ کا دل تڑپ اٹھا ۔ —— "آج میں نے خدا کو دوسری بار آزما لیا —— وہ سچے دلوں کی بات سنتا ہے نہ پاکیزہ دلوں کی"

ریکھا کے سانس ختم ہو گئے —— جگدیپ کے چلتے ہوئے سانسوں میں جیسے جان نہ رہی ہو۔

جگدیپ کے دل پر کیا گذر رہی تھی اس کا حال صرف ریکھا کی سہیلی کو معلوم تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ تو رو سکتی تھی۔ دل کھول کر رو سکتی تھی مگر جگدیپ رو بھی نہیں سکتا تھا ۔ وہ جگدیپ کے قریب آکر دھاڑیں مار کر رونے لگی۔

"ایک بات سنو —— "جگدیپ کے منہ سے نکلا۔

"ریکھا نے ستاروں والا دوپٹہ مانگا تھا۔!"

"ہاں ۔"

"وہ لے دیدو۔"

جگدیپ سے جایا نہیں جاتا تھا —— ریکھا کی سہیلی نے جگدیپ سے چابی لی اور اس کے گھر جا کر اس کا صندوق ٹٹول کر ستاروں والا دوپٹہ لے آئی —— جگدیپ کو

یوں لگا اسکی ماں نے جھانجریں اور دوپٹہ اس کے لیے دو امانتیں رکھی تھیں
جھانجریں اس کی شہرت نے پہن لی تھیں اور دوپٹہ آج ریکھا نے اوڑھ لیا تھا۔
"یہ دوپٹہ ریکھا نے ایک مدت سے رکھا ہوا تھا اور اس نے مجھ سے کہا تھا کہ
میں آخری وقت پر یہ دوپٹہ اسے اڑھا دوں۔"
ریکھا کی سہیلی نے ریکھا کے خاوند سے کہا اور ریکھا کے سر پہ دوپٹہ ڈالتے ہوئے
اسے یوں محسوس ہوا کہ آج اس نے جھوٹ بولا تھا لیکن اس سے بڑا سچ شاید کوئی تھا نہیں۔
اب اخباری نمائندوں کو کوئی روک نہیں سکتا تھا وہ لپنے قلم لے آئے۔
کیمرے لے آئے جگدیپ ریکھا کے سر پہ لپٹا ہوا ستاروں والا دوپٹہ دیکھ رہا تھا۔
کہ ریکھا کی سہیلی نے کاغذ کا ایک چھوٹا سا پرزہ جگدیپ کے ہاتھ میں دیدیا "رات
کو جب ریکھا کی حالت خراب ہو گئی تھی تو اس نے دو شعر لکھے تھے اور کہا تھا کہ تمہیں دیدوں۔
جگدیپ نے کاغذ کی تہہ کھولی۔ لکھا تھا۔

درِ جمیل پہ سورج برات لے آیا!
کوئی کرن بھی قدم اس کے اٹھ کے لے نہ سکی

ہمارے عشق نے سادہ سا اک سوال کیا
کہ جس کا ساری خدائی جواب دے نہ سکی

وقت تھرتھراتا ہوا رک گیا۔ جیسے اس سوال کو پڑھنے کے لیے کھڑا ہو گیا ہو۔ اور
پھر سر جھکا کر اپنے راستے پر ہو لیا۔ جیسے اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔